رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۴۰۳

شعبان المعظم ۱۳۷۰ھ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت فی پرچہ دس آنے

قیمت سالانہ چھ روپے

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین پر مولانا نے ہر طرح کے سوالات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

جلد شائع ہو رہی ہے

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۴۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۱	صفر ۱۳۷۴ھ - مطابق نومبر ۱۹۵۳ء	عدد ۲

(ابوالخیر مودودی نے پاکستان پرنٹنگ پریس، لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن،
اچھرہ، لاہور سے شائع کیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

عربی زبان میں تزکیہ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تطہیر یعنی پاک صاف کرنا۔ دوسرے تنمیہ یعنی نشو و نما دینا، بڑھانا اور ترقی دینا۔ پس تزکیۂ نفس کا مفہوم یہ ہوا کہ نفس کو بری صفات سے پاک کیا جائے اور اچھی صفات کی آبیاری سے اس کو نشو و نما دیا جائے۔

یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو آج کل کی زبان میں تربیت اور تعمیر سیرت کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اس سے مقصود اس طرز کے انسان تیار کرنا ہوتا ہے جو کسی کو مطلوب ہوں۔

اس تزکیہ و تربیت، یا بالفاظ دیگر، انسان سازی کی شکل متعین کرنے والی چیز، جیسا کہ ہم ان صفحات میں اس سے پہلے بتفصیل بیان کر چکے ہیں، وہ نصب العین ہے جو انسان تیار کرنے والے کے پیش نظر ہو۔ جیسا نصب العین اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے ویسے ہی آدمی وہ تیار کرنا چاہتا ہے، اور جیسے آدمی وہ تیار کرنا چاہتا ہے اسی کے لحاظ سے وہ یہ طے کرتا ہے کہ کونسی صفات اصل نصب العین کی ضد اور اس کے حصول میں مانع ہیں اور کونسی صفات اس سے مطابقت رکھتی ہیں اور اس کے حصول میں مددگار ہیں، پھر اسی کے لحاظ سے وہ ایسی تدابیر اختیار کرتا ہے جن سے غیر مطلوب صفات کو دبایا اور مٹایا جائے اور مطلوب صفات کو ابھارا اور نشو و نما دیا جائے۔

اب اگر ہم اسلامی تزکیۂ نفس کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے اس نصب العین کو جاننا چاہیے جو انسان سازی میں اسلام کے پیشِ نظر ہے۔ اس باب میں اللہ اور اس کے رسول نے اپنے مدعا کی توضیح ایسے واضح طریقے سے کی ہے کہ کسی التباس و اشتباہ کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ ۔ (البینہ)

ان کو اس کے سوا اور کسی چیز کا حکم نہیں دیا گیا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنی اطاعت کو اس کے لیے خالص کر کے پوری طرح یکسو ہو کر۔

اور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس بندگی کا معیار مطلوب یہ بیان فرماتے ہیں :۔

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

خوبی یہ ہے کہ تو اللہ کی بندگی اس طرح کر کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، یا اگر اس حد تک نہیں تو کم از کم اس احساس کے ساتھ کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

پھر قرآن میں ارشاد ہوتا ہے :۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۔ (آل عمران - ۱۱)

اور تم سے ایک ایسا گروہ وجود میں آئے جو نیکی کی طرف دعوت دے، بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایسے انسان تیار کرنا چاہتا ہے جو فرداً فرداً اپنی گردن سے تمام اطاعتوں اور تمام بندگیوں کے حلقے اتار کر خالص اللہ کی بندگی و غلامی کا حلقہ کسی مجبوری کے بغیر آپ اپنی ہی رضا و رغبت سے پہن لیں، اور پھر اللہ کی اطاعت و خدمت اس نوکر کی طرح انتہائی وفاداری، خوف و خشیت اور حسن کارکردگی کے ساتھ کریں جو اپنے آقا کو سامنے کھڑا دیکھ کر یا یہ محسوس کر کے کہ آقا کی نگاہ اس پر ہے، زیادہ سے زیادہ بہتر کام کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ڈرتا رہتا ہے کہ اس کی کوئی بات آقا کے غضب کی موجب نہ ہو۔ پھر اس قسم کے افراد کو جوڑ کر اسلام ایک ایسا منظم گروہ وجود میں لانا چاہتا ہے جو دنیا کو خیر کی طرف بلانے اور نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لیے اٹھے جس کی ساری جدوجہد اور سعی و عمل صرف اس لیے ہو کہ دنیا سے فساد، جو اللہ کو مبغوض ہے مٹ جائے، اور خیر و صلاح، جو اللہ کو محبوب ہے، اس کی جگہ قائم ہو، جو خیر کا علم ہاتھ میں لے کر دنیا بھر سے اس کے لیے لڑ جانے پر تیار ہو اور سارے جہان سے اس کی کشمکش اور نزاع صرف اسی ایک بات پر ہو کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور

اس کے آگے سارے گلے دب کر رہ جائیں۔

اسلام جو تزکیۂ نفس کرتا ہے وہ اسی مقصد کے لیے کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اللہ کے امتحان میں انسان کی کامیابی اور اللہ کے قرب سے اس کی سرفرازی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس کی عبدیت کامل ہو اور وہ انفرادی و اجتماعی طاقت سے زمین پر اللہ کے منشا یعنی قیامِ خیرات و ازالۂ سیئات کو پورا کرے۔ اسی مقصد کی مناسبت سے اسلام نے انسانی صفات کو محمود اور غیر محمود، اور مطلوب اور غیر مطلوب میں تقسیم کیا ہے۔ فرد اور جماعت دونوں میں جو صفات عبدیت کی ضد ہیں اور اقامتِ حق کی سعی میں سدِّ راہ ہیں انہی کو اسلام غیر محمود قرار دیتا ہے اور انفرادی نفوس اور اجتماعی نظام کو ان سے پاک کرنا چاہتا ہے اور جو صفات عبدیت کے مقتضیات و لوازم میں سے ہیں اور جن سے اقامتِ حق کی سعی میں مدد ملتی ہے وہی اسلام کی نگاہ میں محمود ہیں، اور وہ فرد اور جماعت کو ان سے آراستہ کرنا چاہتا ہے۔ قرآن اور حدیث کا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو پوری تفصیل کے ساتھ ان صفات محمودہ اور غیر محمودہ کی ایک مکمل فہرست بنائی جاسکتی ہے، اور یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کون کون سی صفات کس درجہ میں محمود یا غیر محمود ہیں، اور ان تدابیر کا بھی پورا خاکہ مرتب کیا جاسکتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے تزکیۂ نفوس کے لیے تجویز کی ہیں۔ یہ چیز اس قدر واضح اور مکمل طریقے سے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ میں ہمیں مل جاتی ہے کہ اس سے باہر کہیں اور اسے تلاش کرنے کی قطعاً کوئی حاجت باقی نہیں رہتی، البتہ جس کے پیشِ نظر اسلام کے مقصد سے الگ کچھ دوسرے مقاصد ہوں وہ بلاشبہ اس منبع میں اپنی پیاس بجھانے والی چیز نہیں پاسکتا اور مجبوراً اسے دوسرے چشموں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

اب ہم سب سے پہلے قرآن سے اور پھر حدیث سے اُن بُرائیوں کی ایک فہرست بنائیں گے جن سے فرد اور جماعت کو پاک کرنا مطلوب ہے۔ پھر اسی طرح ایک دوسری فہرست اُن بھلائیوں کی مرتب کریں گے جنہیں فرد اور جماعت میں نشو و نما دینا مطلوب ہے۔ اس کے بعد اس تطہیر اور تنمیہ کی تدابیر کا پورا

تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں گے تاکہ وہی ہمارے تزکیہ کا پروگرام قرار پائے۔

قرآن کریم میں جن اوصاف و اعمال کو مذموم قرار دیا گیا ہے ان کی فہرست مختلف طریقوں سے مرتب کی جا سکتی ہے، لیکن ہمارے مقصد کے لیے موزوں ترین ترتیب یہ ہو گی کہ جن الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کسی وصف یا فعل کی مذمت فرمائی ہے انہی کو عنوانِ فصل بنایا جائے تاکہ ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا جائے کہ کونسی چیز قرآن کے نقطۂ نظر سے کس درجہ میں مذموم ہے۔ اسی ترتیب کو اختیار کر کے ہم حتی الامکان تمام مذمومات قرآنی کو سلسلہ وار درج کریں گے۔

۱۔ وہ اوصاف و اعمال جن کو اللہ تعالیٰ فسق (یعنی خروج از طاعت) سے تعبیر فرماتا ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفٰسِقِينَ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ (البقرہ ۳)

اور اللہ اپنی تمثیلات کے ذریعے سے گمراہی میں صرف فاسقوں کو مبتلا کرتا ہے جو اللہ کے عہد کو اس کے استوار ہو جانے کے بعد توڑتے ہیں اور ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ یہی لوگ خسارے میں رہنے والے ہیں۔

سَأُورِيكُمْ دَارَ الْفٰسِقِينَ سَأَصْرِفُ عَنْ آيٰتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيٰتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غٰفِلِينَ (الاعراف ۱۷)

میں تمہیں فاسقوں کے گھر (یعنی ان کی تباہ شدہ بستیاں) دکھاؤں گا۔ میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جن کے ڈھنگ یہ ہیں کہ زمین میں بغیر کسی حق کے تکبر کرتے ہیں، خواہ کوئی نشان دیکھ لیں مگر مان کر نہ دیں، سیدھا طریقہ دیکھیں تو اسے اختیار نہ کریں، ٹیڑھا طریقہ دیکھیں تو اس پر چل پڑیں۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے ہمارے ارشادات کو جھٹلایا اور ان سے غافل رہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسٰهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ (الحشر ۳)

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو خدا فراموشی کے مرتکب ہوئے تو خدا نے ان کو خود فراموشی میں مبتلا کر دیا۔ یہی لوگ فاسق ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (المائدہ-۶)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ ٱقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ (التوبہ-۳)

اے نبی کہو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی بند اور بیویاں اور رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے نقصان کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ گھر بار جو تم کو پسند ہیں، تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول اور راہِ خدا کی جدوجہد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ نافذ کردے، اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (التوبہ-۹)

منافق مرد اور منافق عورتیں آپس میں ہم رنگ ہیں۔ ان کے ڈھنگ یہ ہیں کہ بری باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے روکتے ہیں اور اپنی مٹھیاں بند رکھتے ہیں (یعنی ادائے حقوق اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے سے باز رہتے ہیں)، درحقیقت یہ منافق پرلے درجے کے فاسق ہیں۔

... ذٰلِكَ أَدْنٰى أَنْ يَّأْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَا أَوْ يَخَافُوْا أَنْ تُرَدَّ أَيْمَانٌ بَعْدَ أَيْمَانِهِمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (المائدہ-۱۴)

.... اس سے یہ امر زیادہ متوقع ہے کہ لوگ ٹھیک شہادت دیں گے یا کم از کم اس بات ہی کا خوف کریں گے کہ ان کی قسموں کے بعد دوسری قسمیں کہیں پیش نہ کر دی جائیں۔ اللہ سے ڈرو اور سنو، اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النور-۱)

اور جو لوگ شریف عورتوں کو تہمت لگائیں پھر چار گواہ اپنے الزام کی تائید میں پیش نہ کریں ان کو ۸۰ کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ یہ لوگ پکے فاسق ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن میں ایسے تمام لوگوں کو فاسق اور ان کے عمل کو فسق قرار دیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی علانیہ خلاف ورزی کریں یا ان افعال کے مرتکب ہوں جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو المائدہ ۱۷، انعام ۱۴، اعراف ۲۱، عنکبوت ۴۔

۲۔ وہ اوصاف و اعمال جن کو اللہ فساد اور جن کے مرتکبین کو مفسد قرار دیتا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ زِدْنٰھُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا کَانُوْا یُفْسِدُوْنَ۔ (النحل۔۱۲)

جن لوگوں نے خود دعوت حق کو ماننے سے انکار کیا اور دوسروں کو بھی خدا کے رستے سے روکا انہیں ہم عذاب پر عذاب دیں گے اس فساد کی وجہ سے جو وہ کرتے رہے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَتْھُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَۃً قَالُوْا ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ وَجَحَدُوْا بِھَا وَاسْتَیْقَنَتْھَآ اَنْفُسُھُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُفْسِدِیْنَ (النمل۔۱)

پس جب ہماری نشانیاں ان کے سامنے علانیہ آگئیں تو انہوں نے کہا یہ تو کھلا جادو ہے۔ ان کے دل اندر سے قائل ہو چکے تھے مگر انہوں نے محض زیادتی اور سرکشی کی راہ سے ہماری نشانیوں کا انکار کیا تو دیکھو کہ ان مفسدوں کا انجام کیا ہوا۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَۃً مِّنْھُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَھُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَھُمْ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ۔ (القصص۔۱)

فرعون نے زمین میں سر اٹھایا اور باشندگان ملک کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جن میں سے ایک گروہ کو وہ کمزور بنا کر رکھتا اور ان کے لڑکوں کو قتل کرتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ یقیناً وہ مفسدوں میں سے تھا

اَئِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَرَ۔۔۔ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَی الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ۔ (عنکبوت ۳)

(لوط نے اپنی قوم سے کہا) کیا تم لوگ ایسے بدکار ہو گئے ہو کہ مردوں سے خواہش نفس پوری کرتے ہو اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں علانیہ برے کام کرتے ہو۔۔۔ لوط نے کہا پروردگار! ان مفسد لوگوں کے مقابلہ میں میری مدد کر۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ۔ (القصص-۸)

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا، مگر اس نے (اپنی ناجائز زراندوزی اور اپنی دولت مندی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی صورت میں) اپنی قوم پر دست درازی شروع کر دی ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقتور آدمیوں کا ایک گروہ بمشکل اٹھا سکتا تھا۔ اس کی قوم والوں نے اس سے کہا کہ اکڑ نہیں اللہ کو اکڑنے والے پسند نہیں ہیں، اور جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت میں اپنا انجام درست کرنے کی فکر کر اگرچہ دنیا میں بھی اپنا حصہ بھول نہ جا، اور احسان کر جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کے درپے نہ ہو، یقیناً اللہ کو مفسد پسند نہیں ہیں۔

وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (ہود-۸)

(شعیب نے کہا) اے میری قوم کے لوگو! پورا ناپو اور ٹھیک تولو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ (محمد-۳)

تو تم (منافقو) سے اس کے سوا اور کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ اختیارات تمہارے ہاتھ میں آ جائیں تو زمین میں فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے (جس طرح زمانہ جاہلیت میں کرتے رہے ہو)

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ وَإِذَا تَوَلَّىٰ

لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جس کی باتیں دنیوی زندگی کے معاملات میں تم کو بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں وہ اپنے حسنِ نیت پر قسمیں کھا کھا کر خدا کو گواہ بناتا ہے حالانکہ

سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (البقرہ-۲۵)

وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے اور جب وہ یہ باتیں بنا کر پلٹتا ہے (یا جب زمام اختیار اس کے ہاتھ میں آتی ہے) تو زمین میں اس کی تمام دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد برپا کرے اور کھیتوں اور نسلوں کو غارت کرے، حالانکہ اللہ کو فساد پسند نہیں ہے اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈر تو جھوٹے وقار کا خیال اسے گناہ پر جما دیتا ہے۔

وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ كُلَّمَا اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (المائدہ-۹)

اور ہم نے یہودیوں کے درمیان قیامت تک کیلیے عداوت اور نفرت ڈال دی ہے۔ جب کبھی وہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اس کو بجھا دیتا ہے۔ وہ زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ کو مفسد پسند نہیں ہیں۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا۔۔۔۔ (المائدہ - ۵)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں (یعنی ملک میں جو صالح نظام قائم ہو چکا ہے اسے درہم برہم کرنا چاہتے ہیں) ان کی سزا تو یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۳۔ وہ اوصاف و اعمال جن کو اللہ نے ظلم اور جن کے مرتکبین کو ظالم قرار دیا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا۔ (البقرہ-۲۰)

لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کے سوا دوسروں کو اللہ کا مدمقابل بنا لیتا ہے، ان سے ایسی محبت کرتا ہے جیسی خدا سے ہونی چاہیے حالانکہ ایمان لانے والے سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں کاش یہ ظالم لوگ جو کچھ عذاب سامنے آنے پر دیکھیں گے

وہ ابھی دیکھ لیتے کہ قوت ساری کی ساری اللہ ہی کی ہے۔

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ بَلِ الظّٰلِمُونَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ۔ (لقمان-۱)

یہ سب تو اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں اب ذرا مجھے دکھاؤ کہ دوسرے بناوٹی خداؤں نے کیا پیدا کیا ہے؟ مگر ظالم لوگ ہیں کہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ۔ (لقمان-۲)

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر کہ شرک بڑا ظلم ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسٰى بِآيٰتِنَا إِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهِ فَظَلَمُوا بِهَا۔ (اعراف-۱۳)

پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد موسیٰ کو فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا، مگر ان لوگوں نے ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا (یعنی جو صریح حق کی نشانیاں تھیں ان کو جھوٹ اور جعل قرار دیا)

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام-۱۷)

پھر اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کے نام سے خود ایک جھوٹ تصنیف کرے تاکہ علم حق کے بغیر لوگوں کی رہنمائی کرے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيٰتِهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُونَ۔ (انعام-۱۴)

اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کے نام سے خود کوئی جھوٹ بنائے یا اللہ کی سچی آیت کو جھٹلائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے ظالم فلاح نہیں پاتے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ... قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرٰاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ۔ (آل عمران-۱۰)

ساری کھانے کی چیزیں (جو شریعت محمدی میں حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں۔ . . . (اے نبی!) ان یہودیوں سے کہو کہ توراۃ لے آؤ اور پڑھو اگر تم سچے ہو۔ پھر اس کے بعد جو اللہ کی طرف جھوٹی بات منسوب کریں (یعنی جسے اللہ نے حرام نہیں ٹھیرایا اس کے متعلق کہیں کہ اللہ نے اسے حرام قرار

دیا ہے) وہی ظالم ہیں۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا
مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ
مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَیْرٰتِ
بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (فاطر-۴)

پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے جن کو ایمان اور اتباع پیغمبر کے لیے چھانٹ لیا تھا انہیں کتاب کا وارث بنایا، اس کے بعد کوئی ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہوا (یعنی اس نے اللہ کی کتاب پائی مگر اس کی پیروی نہ کی) اور کوئی معتدل رہا اور کوئی اللہ کے اذن سے نیکیاں سمیٹنے میں سبقت کرنے والا ہوا۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ
فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدہ-۷)

اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ
مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّکَ اِذًا لَّمِنَ
الظّٰلِمِیْنَ۔ (البقرہ-۱۰)

جو علم حق تیرے پاس آگیا ہے اگر اس کے آجانے کے بعد تو نے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو پھر تیرا شمار ظالموں میں ہوگا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ
مِنَ اللّٰهِ۔ (البقرہ-۱۶)

اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک شہادت ہو (یعنی جسے معلوم ہو کہ کتاب الہٰی کی رو سے امر حق کیا ہے) اور وہ اس کو چھپائے۔

لَا تَتَّخِذُوْا اٰبَآءَکُمْ وَاِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ
اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ وَمَنْ
یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْکُمْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (التوبہ-۳)

اگر تمہارے باپ اور بھائی بند ایمان کے مقابلہ میں کفر کو محبوب رکھتے ہوں تو انہیں اپنا رفیق نہ بناؤ۔ تم میں سے جو ایسے لوگوں کو اپنا رفیق بنائے گا وہی ظالم ہوگا۔

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِیَحْکُمَ
بَیْنَهُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ وَ
اِنْ یَّکُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ یَاْتُوْٓا اِلَیْهِ مُذْعِنِیْنَ
اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ یَخَافُوْنَ

اور جب انہیں اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ رسول ان کے معاملات کا فیصلہ (قانون الہٰی کے مطابق) کرے تو ان میں سے ایک گروہ پہلو تہی کر جاتا ہے، البتہ اگر فیصلہ ان کی تائید میں ہو تو یہ لوگ اطاعت کیش بنے

اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ وَرَسُوْلُہٗ بَلْ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (النور-۶)

ہوئے رسول کی طرف آ جائیں۔ کیا ان کے دلوں کو کوئی روگ لگا ہوا ہے؟ یا یہ شک میں ہیں؟ یا انہیں اندیشہ ہے کہ اللہ اور رسول ان پر ظلم کریں گے؟ نہیں بلکہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں۔

فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْہِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْہُمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۔ (بقرہ-۳۲)

پھر جب ان لوگوں کو راہِ خدا میں جنگ کرنے کا حکم دیا گیا تو ایک قلیل گروہ کے سوا سب منہ پھیر گئے اور اللہ خوب جانتا ہے کہ ان ظالموں کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰہُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِہِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا۔ (النساء-۱۴)

جن لوگوں کی روحیں فرشتوں نے اس حال میں قبض کیں کہ وہ اپنے آپ پر خود ظلم کر رہے تھے (یعنی ایمان لے آنے کے باوجود اطمینان کے ساتھ دار الکفر میں زندگی بسر کر رہے تھے) ان سے فرشتوں نے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں تھے؟ انہوں نے کہا ہم زمین میں کمزور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟

وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (بقرہ-۲۹)

اور جو لوگ (اخلاق، معاملات اور معاشرت میں) اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔

لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْہُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْہُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (الحجرات-۲)

مردوں اور عورتوں میں سے کوئی دوسرں کی ہنسی نہ اڑائے، ہو سکتا ہے کہ وہ ان ہنسی اڑانے والوں سے اچھے ہوں اور آپس میں ایک دوسرے پر چوٹیں نہ کرو، نہ پھبتیاں کسو اور نہ بُرے نام رکھو۔ ایمان لانے کے بعد کسی کا بد اخلاقی میں نام پیدا کرنا بہت بری ناموری ہے۔ اور جو اس سے باز نہ آئے تو ایسے لوگ ظالم ہیں۔

۴۔ وہ اوصاف و اعمال جن کو اللہ تعالیٰ انسانیت کے خلاف قرار دیتا ہے:۔

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا (الفرقان ۴)

تم نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا رکھا ہے؟ کیا تم ایسے شخص کی ذمہ داری لے سکتے ہو؟ تم شاید یہ سمجھتے ہوگے کہ ان میں بہت سے لوگ کھلے دل سے، بات سننے اور سوچنے سمجھنے کے لیے تیار ہونگے؛ حالانکہ ان کا حال تو جانوروں کا سا ہے بلکہ ان سے بھی کچھ بدتر۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (اعراف ۲۲)

ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کی خدمت نہیں لیتے، ان کے پاس کان ہیں مگر انھیں سننے کی تکلیف نہیں دیتے، وہ جانوروں کی طرح جیتے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر، وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ۔ (محمد ۔ ۲)

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ دنیا کے سامانِ زندگی سے بس اسی طرح فائدہ اٹھاتے اور کھاتے پیتے ہیں جیسے جانور۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ۔ (بقرہ ۔ ۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو تعلیم ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقہ پر چلے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، چاہے ان کے باپ دادا کیسی ہی بے وقوفیاں کرتے رہے ہوں اور راہِ راست پائے ہوئے نہ ہوں۔ ان منکرینِ حق کا حال بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص ان جانوروں کو خطاب کر رہا ہو جو بجز ایک آواز اور ہانک پکار کے کچھ نہ سنتے ہوں (اور اپنی ڈگر پر چلے جا رہے ہوں)، بہرے

گونگے، اندھے، کچھ نہیں سوچتے :

اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ - (انفال-۲۰)

اللہ کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ لوگ ہیں جو حق سننے اور حق بولنے کے لیے، بہرے اور گونگے ہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے (کہ حق کو سمجھیں)

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ (اعراف-۲۲)

اور انہیں اس شخص کا قصہ سناؤ جسے ہم نے اپنی آیات کا علم دیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ بھٹکے ہوئے لوگوں میں شامل ہوگیا۔ اگر ہم چاہتے تو انہی آیات کے علم سے اس کو بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین (یعنی دنیا) سے چمٹ کر رہ گیا اور اپنی خواہشات کا پیرو بن گیا پس اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ خواہ تو اس پر حملہ کرے یا اس سے بے اتفاتی کرے مگر وہ بہر حال (حرص کے مارے) زبان ہی لٹکائے رہے۔

اعتذار

پچھلے شمارہ میں "نظرۃ اجمالیۃ فی تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ" پر تعارف جناب مولانا محمد ناظم صاحب پرنسپل جامعہ عباسیہ بہاولپور نے لکھا تھا۔ غلطی سے مولانا موصوف کا نام چھپنے سے رہ گیا۔ اس فروگذاشت کے لیے ہم مولانا سے معذرت چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ اس کے لیے ہمیں معاف فرمائیں گے۔

مدیر

بدءُ الوحی اور تباشیرِ نبوّت

از : جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی

رسوم جاہلیت سے خداداد تنفّر اور بیزاری | انبیاء و مرسلین اگرچہ نبوت و رسالت سے پہلے نبی اور رسول نہیں ہوتے مگر ولی اور صدیق ضرور ہوتے ہیں، اور ان کی ولایت ایسی کامل اور اتم ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑے ولی اور صدیق کی ولایت کو ان کی ولایت سے وہ نسبت بھی نہیں ہوتی جو قطرہ کو دریا کے ساتھ یا ذرہ کو آفتاب کے ساتھ ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے بارہ میں حق تعالیٰ شانہٗ کا یہ ارشاد وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ اور حضرت یوسف علیہ السلام کا تمام واقعہ اور خصوصاً اُن کا یہ ارشاد وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ اور حق تعالیٰ شانہٗ کا حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارہ میں یہ ارشاد وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَّحَنَانًا وغیر ذالک سب اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرات انبیاء نبوت و بعثت سے پہلے ہی اعلیٰ درجہ کے ولی اور صدیق ہوتے ہیں۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابتداء ہی سے شرک اور بت پرستی سے اور تمام مراسم شرک سے بالکل پاک اور منزہ رہے۔ جیسا کہ ابن ہشام کی روایت میں ہے:۔

فَشَبَّ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم والله يكلأه ويحفظه ويحوطه من اقذار الجاهلية لما يريدُ به من كرامته ورسالته حتى بلغ أن كان رجلا افضل قومه مروءة واحسنهم خلقا واكرمهم حسبا واحسنهم جوارا واعظمهم حلما واصدقهم حديثا واعظمهم امانة	پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں جوان ہوئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت و نگرانی فرماتے تھے اور جاہلیت کی تمام گندگیوں سے آپ کو پاک اور محفوظ رکھتے تھے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہو چکا تھا کہ آپ کو نبوت و رسالت اور ہر قسم کی عزت و کرامت سے سرفراز فرمائے یہاں تک کہ آپ مرد کامل ہو گئے اور مروت اور حسن خلق اور حسب و نسب اور حلم اور بُردباری

والبعدهم من الفحش والاخلاق التی	اور راستبازی، صداقت و امانت میں سب سے بڑھ گئے
تدنس الرجال تنزها و تکرما حتیٰ ما	اور فحش و اخلاق رذیلہ سے انتہا درجہ دُور ہو گئے یہاں
اسمہ فی قومہ الا الامین لما جمع	تک کہ آپ اپنی قوم میں امین کے نام سے مشہور ہو گئے
اللہ فیہ من الامور الصالحۃ	یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اعمالِ صالحہ آپ کی ذات
(سیرۃ ابن ہشام - ج ۱ ص ۶۳)	میں جمع کر دیئے تھے۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے عرض کیا گیا کہ کیا آپ نے کبھی کسی بُت کو پوجا ہے؟ آپ نے فرمایا "نہیں" - پھر پوچھا گیا کہ "کبھی آپ نے شراب پی ہے"؟ آپنے فرمایا "نہیں"۔ اور یہ بھی فرمایا کہ "میں ہمیشہ سے ان چیزوں کو کفر سمجھتا تھا، اگرچہ مجھ کو کتاب اور ایمان کا علم نہ تھا۔" (اخرجہ ابو نعیم و ابن عساکر؛ خصائص کبریٰ ج ۱ ص ۸۹)۔

مُسند احمد میں عروۃؓ بن زبیر سے مروی ہے کہ "مجھ سے حضرت خدیجہؓ کے ایک ہمسائے نے بیان کیا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خدیجہؓ سے یہ کہتے سُنا "خدا کی قسم میں کبھی لات کی پرستش نہ کرونگا۔ خدا کی قسم کبھی عُزّیٰ کو نہ پُوجوں گا۔ (خصائص ج ۱ ص ۹۰)

زید بن حارثہؓ فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جب مشرکین بیت اللہ کا طواف کرتے تو اساف[1] اور نائلہ کو چھوتے تھے۔ ایک بار میں نے آپ کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کیا۔ جب میں اُن بتوں کے پاس سے گزرا تو ان کو چھُوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو منع فرمایا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ دیکھوں تو سہی چھُونے سے ہوتا کیا ہے اس لیے دوبارہ ان کو چھُوا۔ آپ نے پھر ذرا سختی سے فرمایا کہ کیا تم کو منع نہیں کیا تھا۔ زید فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم اس کے بعد پھر کبھی کسی بت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا اور آپ پر اپنا کلام اُتارا۔ یہ روایت مستدرک حاکم اور دلائل ابی نعیم اور دلائل بیہقی میں مذکور ہے۔ حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ (خصائص کبریٰ - ج ۱ ص ۸۹)

---

[1] اساف اور نائلہ، یہ دو بتوں کے نام ہیں

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ کو جاہلیت کی کسی بات کا کبھی خیال ہی نہیں آیا صرف دو مرتبہ ایسا خیال آیا مگر اللہ نے بچالیا اور مجھ کو اس سے محفوظ رکھا۔ ایک شب میں نے اپنے ساتھی سے کہا جو میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتا تھا کہ تم بکریوں کی خبر رکھنا اور میں مکہ جاکر کچھ قصے کہانیاں سن کر آتا ہوں۔ میں مکہ میں داخل ہوا تو ایک مکان سے گانے بجانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ فلاں کی شادی ہے۔ میں بیٹھا ہی تھا کہ فوراً نیند آگئی اور خدا نے میرے کانوں پر مہر لگا دی۔ پھر جو سویا تو خدا کی قسم آفتاب کی تمازت ہی نے مجھ کو بیدار کیا۔ اٹھ کر اپنے ساتھی کے پاس آیا۔ ساتھی نے دریافت کیا کہ بتلاؤ کیا دیکھا؟ میں نے کہا کچھ بھی نہیں" اور اپنے اس سونے کا واقعہ بیان کیا۔

دوسری شب میں نے پھر یہی ارادہ کیا، لیکن خدا کی طرف سے پھر یہی صورت پیش آئی۔ آپ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اس کے بعد پھر میرے دل میں اس قسم کا کوئی خیال ہی نہیں آیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنی پیغمبری سے سرفراز فرمایا" یہ حدیث مسند بزار اور مسند اسحٰق بن راہویہ وغیرہ میں مذکور ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند متصل اور حسن ہے۔ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ (خصائص کبریٰ ج ۱ صـ۸۹)

بخاری اور مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ تعمیر کعبہ کے وقت آپ بھی پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے کہ آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا کہ بیٹا تہبند کھول کر کندھے پر ڈال لو تاکہ پتھروں کی رگڑ سے محفوظ رہو۔ آپ نے چچا کے کہنے سے تہبند کھولا۔ کھولتے ہی آپ بیہوش ہو کر گر پڑے اس کے بعد آپ کبھی برہنہ نہیں دیکھے گئے۔

ابو الطفیلؓ سے مروی ہے کہ اس وقت آپ کو غیب سے یہ آواز سنائی دی "یا محمد عورتک" اے محمد! اپنے ستر کی خبر لو۔ یہ غیبی آواز سب سے پہلی آواز تھی جو آپ کو سنائی دی" ابو الطفیل کی یہ روایت دلائل ابی نعیم اور دلائل بیہقی اور مستدرک حاکم میں مذکور ہے۔ حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ (خصائص کبریٰ ج ۱ صـ۸۸)

ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ ابوطالب نے آپ سے پوچھا کہ کیا ماجرا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ ایک سفید پوش آدمی دکھلائی دیا جس نے کہا کہ "اے محمد! اپنے ستر کو چھپاؤ"۔ حاکم فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح ہے۔ (اخرجہ ابن سعد وابن عدی والحاکم وصححہ وابوداؤد من طریق عکرمۃ عن ابن عباس۔ الخ۔ خصائص کبریٰ ج ۱۔ صـ۸۸)

ایک مرتبہ قریش نے آپ کے سامنے کھانا لاکر رکھا۔ اس مجلس میں زید بن عمرو بن نفیل بھی تھے۔ آپ نے اس کے کھانے سے انکار کیا۔ بعد ازاں زید نے بھی انکار کیا اور کہا میں بتوں کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانور اور بتوں کے چڑھاوے نہیں کھاتا۔ میں صرف وہی چیز کھاتا ہوں جس پر صرف اللہ کا نام لیا جائے۔ زید بن عمرو بن نفیل قریش سے یہ کہا کرتے تھے کہ بکری کو اللہ ہی نے پیدا کیا اور اللہ ہی نے اس کے لیے آسمان سے پانی برسایا اور اللہ ہی نے زمین سے اس کے لیے گھاس اگائی۔ پھر تم اس کو غیر اللہ کے نام پر کیوں ذبح کرتے ہو"۔ (بخاری ج ۱ صـ۵۳۹۔ باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل)۔ زید بن عمرو بن نفیل حضرت عمر بن الخطابؓ کے چچا زاد بھائی اور سعید بن زیدؓ (جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) کے والد ماجد ہیں۔ شرک اور بت پرستی سے بیزار اور دین حق کے متلاشی تھے۔ بعثت سے پانچ سال قبل جس وقت خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی اس وقت انتقال کیا۔ تفصیل کے لیے فتح الباری۔ ج ۷ صـ۱۰۸ تا صـ۱۱۱ اور اصابہ۔ ج ۱ صـ۵۶۹ ترجمۂ زید بن عمرو بن نفیل اور طبقات ابن سعد ج ۱ صـ۱۰۵۔ باب علامات النبوۃ قبل البعثۃ، مطالعہ کریں۔

بدءالوحی اور تباشیر نبوت روایات مذکورۂ بالا سے یہ امر بخوبی ثابت ہو گیا کہ حضرت انبیاء اللہ نبی ہونے سے پیشتر ہی کفر اور شرک اور ہر قسم کے فحشاء اور منکر سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں۔ ابتداہی سے ان حضرات کے قلوب مطہرہ توحید و تفرید اور خشیت و معرفت سے لبریز ہوتے ہیں۔

---

[1] بدءالوحی سے مراد آغاز نبوت ہے یعنی وحی کی ابتداء کس طرح ہوئی اور تباشیر نبوت سے نبوت و رسالت کے مبشرات اور مبادی مراد ہیں۔ یعنی وہ امور کہ جو صریح نبوت و رسالت تو نہیں مگر نبوت و رسالت کا دیباچہ اور پیش خیمہ ہیں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ جو حضرات عنقریب کفر اور شرک کو مٹانے کے لیے اور ہر فحش اور منکر سے بچانے کے لیے اور ہر خیر کی طرف دعوت دینے کے لیے من جانب اللہ مبعوث ہونے والے ہیں اور خدا کے مجتبیٰ اور مصطفیٰ برگزیدہ اور پسندیدہ بندے بننے والے ہیں۔ معاذ اللہ وہ خود ہی منصب نبوت و رسالت اور خلعت اجتباء و اصطفاء کی سرفرازی سے پیشتر کفر اور شرک کی نجاست میں ملوث اور فواحش و منکرات کی گندگی سے آلودہ ہوں۔ حاشا ثم حاشا۔ یہ قطعاً ناممکن اور محال ہے۔ حضرات انبیاء نبوت اور بعثت سے پیشتر اگرچہ نبی اور رسول نہیں ہوتے مگر اعلیٰ درجہ کے اولیاء اور عرفاء ضرور ہوتے ہیں۔ صفات خداوندی سے جاہل نہیں ہوتے۔ اور نہ ان کو کسی وقت صفات خداوندی میں کسی قسم کا دھوکہ اور مغالطہ ہوتا ہے اور نہ کسی قسم کا شک اور اشتباہ پیش آتا ہے۔

قال اللہ عزوجل ——— وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ۔	اور تحقیق ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے ان کی شان کے مطابق رشد عطا کیا تھا اور ہم ان کو اور ان کی استعداد کو پہلے ہی سے خوب جانتے تھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ رشد کے کیا معنی ہیں۔ اور رشید اور راشد کس کو کہتے ہیں۔ سورۂ حجرات کی یہ آیت شریفہ اس کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِیْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ یُطِیْعُكُمْ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ۔	اور جان لو کہ تم میں اللہ کے رسول ہیں۔ بالفرض والتقدیر اگر بہت سی باتوں میں تمہارا کہنا ماننے لگیں تو تم بلاشبہ مشقت میں پڑ جاؤ، لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو اس مشقت سے اس طرح بچایا کہ ایمان اور طاعت کو تمہارے دلوں میں محبوب اور مرغوب بنا دیا اور کفر اور فسق اور معصیت کی نفرت تمہارے دلوں میں ڈال دی۔ ایسے ہی لوگ کہ جن کے

دلوں میں ایمان وطاعت کی محبت اور کفر و معصیت کی
نفرت راسخ ہو چکی ہو۔ اللہ کے فضل وانعام سے رشد وہدایت والے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے ہی علیم وحکیم ہیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ قلب میں ایمان واطاعت خداوندی کی محبت اور کفر اور فسق اور معصیت کی نفرت وکراہیت کے راسخ ہو جانے کا نام رُشد ہے۔

اور یہ رُشد حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو حق جل شانہٗ نے ابتدا ہی سے عطا فرما دیا تھا۔ جیسا کہ سورۂ انبیاء کی آیت سے واضح ہے۔ اور رُشد لغتِ عرب میں ضلالت اور گمراہی کے مقابلہ میں مستعمل ہوتا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ :-

قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ رُشد و ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔

جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ابتدا ہی سے رُشد اور ہدایت پر تھے۔ معاذ اللہ گمراہ نہ تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ستاروں اور چاند اور سورج کو دیکھ کر یہ فرمانا ھٰذَا رَبِّیْ ، اس سے حال کے بعض[1] مصنفین کو یہ دھوکا ہوا کہ معاذ اللہ ابھی حضرت ابراہیم شک اور شبہ میں پڑے ہوئے تھے، جب غروب ہوتے دیکھا تب اشتباہ زائل ہوا۔ حاشا ثم حاشا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ابتدا ہی سے شمس وقمر کو خدا کی ادنیٰ مخلوق

---

[1] علامہ شبلی سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۸۱ تقطیع خورد میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نبوت سے پہلے ستاروں کو دیکھا تو چونکہ تجلی کی جھلک تھی، دھوکا ہوا، چاند نکلا تو اور بھی شبہ ہوا آفتاب پر اس سے زیادہ۔ لیکن جب سب نظروں سے غائب ہو گئے تو بیساختہ پکار اٹھے "اِنِّیْ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ"، انتہی کلامہ۔ خدا کی ذات وصفات میں معاذ اللہ انبیاء اللہ کو کبھی دھوکا اور شبہ نہیں ہوتا۔ ناظرین ہمارے اس بیان سے خود سمجھ لیں گے کہ حاشا وکلا حضرت خلیل اللہ کو کوئی دھوکا اور شبہ نہیں ہوا بلکہ خود علامہ ہی کو دھوکا اور شبہ ہو گیا۔ حضرات انبیاء ومرسلین صلوات اللہ وسلامہٗ علیہم اجمعین چاند اور سورج کی چمک اور دمک کو دیکھ کر کبھی دھوکے اور شبہ میں نہیں پڑتے ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام ۔ پس سخن کوتاہ باید والسلام

سمجھتے تھے۔ قوم چونکہ کواکب پرستی میں مبتلا تھی اس لیے ان کے عقیدۂ فاسد کے رد کرنے کے لیے فرمایا کہ اگر بطور فرضِ محال تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ ستارہ تمہارے اعتقاد کے مطابق میرا رب ہے تو بہت اچھا ذرا تھوڑی دیر اس کے غروب اور افول کا انتظار کرو۔ تم کو خود ہی اس کا فانی اور حادث ہونا منکشف ہو جائے گا۔ پھر اسی طرح شمس و قمر کا حادث اور فانی ہونا سمجھایا۔ اس لیے کہ کواکب پرستوں کا عقیدہ یہ تھا کہ غروب کے بعد ستارہ میں وہ تاثیر باقی نہیں رہتی جو طلوع کے وقت تھی۔ پس اگر یہ خدا ہوتے تو ان کی صفتِ تاثیر میں تغیّر اور ضعف نہ آتا۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات تغیّر اور ضعف سے پاک اور منزّہ ہیں۔ حضرت ابراہیم کا یہ تمام کلام اوّل سے آخر تک بطورِ محاجّہ اور مناظرہ تھا۔ (اور محاجہ لغت میں مناظرہ کو کہتے ہیں) جیسا کہ بعد کی آیتیں وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ۔ اور آیہ وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ، صراحتہً اس پر دال ہیں کہ یہ تمامتر کواکب پرستوں کے ساتھ مناظرہ اور مجادلہ تھا، اور یہ وہ حجت اور برہان تھی جو اللہ نے آپ کو مناظرہ کے لیے تلقین کی تھی۔

الحاصل یہ مناظرہ تھا، حضرتِ خلیل کی ذاتی نظر اور فکر نہ تھی۔ کیا حضرت ابراہیم نے اس سے پیشتر کبھی چاند اور سورج کو نہ دیکھا تھا؟ نیز صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب صحاح میں یہ حدیث موجود ہے

كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ	ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔

اور یہ نہیں فرمایا کہ یُسَلِّمَانِہٖ کہ اس کے ماں باپ اس کو مسلمان بنا لیتے ہیں، اس لیے کہ فطرۃً وہ مسلمان ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور صحیح مسلم میں عیاض بن حماد سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

قَالَ اللَّهُ إِنِّي خَلَقْتُ عِبَادِي حُنَفَاءَ	حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندوں کو فطرۃً حنیف پیدا کیا ہے۔

پس جبکہ ہر مولود ابتداہی سے حنیف اور فطرۃً اسلام پر پیدا ہوتا ہے تو جو شخص شیخ ہو تمام انبیاء کا اور امام ہو تمام حُنفاء کا اور مُقتدا ہو تمام موحدین کا، اور قدوہ اور اُسوہ ہو کفر اور شرک سے بری اور بیزار ہونے والوں کا۔ وہ بدرجۂ اولیٰ ابتداء ہی سے حنیف اور رشید ہوگا۔ اور اس کی فطرت سب سے زیادہ سلیم اور اُس کی طبیعت سب سے زیادہ مستقیم ہوگی۔ قرآن کریم میں جابجا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابراہیم حنیف کی ملت کے اتباع کا حکم مذکور ہے

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ

پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ ابراہیم حنیف کی ملت کا اتباع کیجیے، اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔

وقال اللہ تعالیٰ :-

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔

آپ کہہ دیجیے کہ اللہ نے مجھ کو ایک سیدھا راستہ بتایا ہے وہ ایک صحیح دین ہے جو ابراہیم کا طریقہ ہے جن میں ذرہ برابر کجی نہ تھی اور نہ وہ کبھی مشرکین میں سے ہوئے۔

تفصیل اگر درکار ہے تو امامِ جلیل و کبیر حافظ عماد الدین ابن کثیر قدس روحہٗ و نوّر ضریحہٗ، آیت کی تفسیر سے مراجعت فرمائیں۔

زمانۂ جاہلیت میں جبکہ کفر اور شرک کی ظلمتیں ہر طرف چھائی ہوئی تھیں اس وقت زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ بن نوفل اور اس قسم کے موحدین اور حُنفاء کے دلوں میں جو توحید کی روشنی جلوہ گر تھی وہ توحیدِ ابراہیمی کا پرتو اور عکس نہ تھا تو پھر کس کا تھا۔ کیا معاذ اللہ زید اور ورقہ کی فطرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ سلیم تھی؟

قاضی عیاض قدس اللہ سرہٗ شفا میں فرماتے ہیں :-

اعلم منحنا اللہ تعالیٰ وایاک

اے عزیز خوب جان لے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اور تجھ کو

توفیقه ان ما تعلق منه بطریق التوحید والعلم بالله وصفاته والایمان به وبما اوحیٰ الیه فعلیٰ غایة المعرفة ووضوح العلم والیقین والانتفاء عن الجهل بشیٔ من ذالك او الشك او الریب فیه من کل ما یضاد المعرفة بذالك والیقین هذا ما وقع علیه اجماع المسلمین علیه ولا یصح بالبراهین الواضحه ان یکون فی عقود الانبیاء سواه (شفاء قاضی عیاض ج ۲ ص ۸۵)	(اپنی توفیق کی نعمت عطا فرماتے) کہ جس چیز کا اللہ کی توحید اور معرفت اور ایمان اور وحی سے اس کا تعلق ہے وہ حضرات انبیاء کو نہایت کامل اور واضح طریق سے معلوم ہوتی ہے۔ حضرات انبیاء کو خدا کی ذات وصفات کا علم یقینی ہوتا ہے۔ معاذ اللہ کسی چیز سے بے خبر نہیں ہوتے اور نہ ان کو اس بارہ میں کوئی شک اور تردد ہوتا ہے۔ اور ہر اس چیز سے معصوم اور پاک اور منزہ ہوتے ہیں جو اس معرفت اور یقین کے منافی ہو۔ اسی پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے اور براہین قاطعہ اور دلائل واضحہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرات انبیاء کے عقائد میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ یہ کہ حضرات انبیاء اللہ کے نفوس قدسیہ ابتدا ہی سے کفر اور شرک اور ہر قسم کے فحشاء اور منکر سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں۔ شروع ہی سے وہ حنیف اور رشید ہوتے ہیں، فطری طور پر بری بات سے متنفر اور بیزار ہوتے ہیں۔ چنانچہ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

فلما نشأت بغضت الی الاوثان وبُغِّضَ الی الشعر (کنز العمال ج ۶ ص ۳۰۵)[1]	جب میرا نشو و ارتقاء شروع ہوا اسی وقت سے بتوں کی شدید عداوت اور نفرت اور اشعار سے سخت تنفر میرے دل میں ڈال دیا گیا۔

نبی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ سر تا پا حق اور صدق ہو اس کے قول میں اس کے فعل میں اس کی نیت میں، اس کے عزم اور ارادہ میں کہیں کذب اور تخییل کا شائبہ اور نام ونشان بھی نہ ہو۔ لہٰذا

[1] یہ روایت کنز العمال میں بحوالہ ابی یعلیٰ وابی نعیم ذکر کی ہے۔

مناسب ہُوا کہ نبی شاعر نہ ہو، اس لیے کہ شاعر کا کذب اور شوائب کذب سے پاک اور منزہ ہونا ممکن ہے۔ اس لیے ارشاد ہُوا:-

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ — ہم نے آپ کو شاعری کا علم نہیں عطا کیا اور یہ علم آپ کے لیے مناسب بھی نہیں۔

چونکہ منصبِ نبوت و رسالت آپ کے لیے مقدر ہو چکا تھا اس لیے حق جلّ شانہ نے ابتدا ہی سے آپ کے قلب مطہر کو ان تمام امور سے متنفر اور بیزار کر دیا کہ جو منصب نبوت و رسالت کے منافی اور مباین تھے۔ اسی طرح اللہ نے آپ کو بڑھایا اور جوان کیا۔ جب زمانہ نبوت کا قریب آ پہنچا تو رویائے صادقہ[1] اور صالحہ، سچے اور درست خواب دکھلائی دینے لگے۔ نبی نَبَأ سے مشتق ہے۔ لغت عرب میں نَبَأ اس خبر کو کہتے ہیں کہ جو مہتم بالشان اور بالکل صحیح اور واقعہ کے مطابق ہو مطلق خبر کو نَبَاء نہیں کہتے۔ نبی کو نبی اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کو بذریعہ وحی کے اَنْبَاءِ الغیب یعنی غیبی خبروں پر کہ جو نہایت مہتم بالشان اور بالکل صحیح اور واقعہ کے مطابق ہوتی ہیں کبھی غلط نہیں ہو سکتیں۔ نبی کو بذریعہ وحی ایسی خبروں کی اطلاع دی جاتی ہے۔ امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ اپنے ایک مکتوب میں مختصراً نبوت کی حقیقت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

و چنانچہ طور عقل ورائے طور حس است کہ آنچہ بحس مدرک نشود عقل ادراک آں می نماید، ہمچنیں طور نبوت ورائے طور عقل است آنچہ بعقل مدرک نشود بتوسل نبوت بدرک می در آید

جس طرح ادراک عقلی کا طریقہ ادراک حسی کے علاوہ ہے کہ جو شے حس ظاہر سے نہ معلوم ہو سکے عقل اس کا ادراک کر لیتی ہے۔ اسی طرح طریق نبوت طریق عقل سے سوا ہے کہ جن چیزوں کے ادراک سے عقل قاصر اور عاجز ہے وہ چیزیں بذریعہ نبوت ادراک کی جا سکتی ہیں۔

---

[1] حضرات انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کا خواب ہمیشہ صادق (سچا) ہوتا ہے، کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ ہاں دنیا کے لحاظ سے کبھی صالحہ (ٹھیک) ہوتا ہے اور کبھی غیر صالحہ۔ لیکن آخرت کے لحاظ سے ہمیشہ صالحہ ہی ہوتا ہے جیسے مصیبت مومن کے حق میں دنیا کے اعتبار سے مکروہ اور آخرت کے لحاظ سے محبوب اور پسندیدہ (فتح الباری کتاب التعبیر ج ۱۲ ص ۳۶۱)

حس سے فقط محسوسات کا ادراک اور عقل سے فقط معقولات کا ادراک ہو سکتا ہے، لیکن وہ غیبی امور کہ جو حس اور عقل کے ادراک سے بالا اور برتر ہیں نہ وہاں حس کی رسائی ہے اور نہ عقل کی۔ وہ غیبی امور بذریعہ وحی اور نبوت کے منکشف ہوتے ہیں، امورِ غیبیہ کے ادراک کا ذریعہ اور وسیلہ صرف وحی نبوت ہے۔ وحی نبوت کی حقیقت تو حضرات انبیاء ہی سمجھ سکتے ہیں، مگر حق تعالیٰ نے اپنی بے پایاں رحمت سے ہم جیسے نادانوں کے سمجھانے کے لیے وحی نبوت کا ایک نمونہ عطا فرمایا ہے کہ جس کو دیکھ کر کچھ نبوت کی حقیقت کو سمجھ سکیں۔ وحی نبوت کا وہ نمونہ رویائے صالحہ (سچا خواب) ہے کہ جو حس اور عقل کے علاوہ غیبی امور کے انکشافات کا ایک ادنیٰ ذریعہ ہے جس وقت انسان سو جاتا ہے اور اس کے تمام ظاہری و باطنی قوائے ادراکیہ بالکل معطل اور بیکار ہو جاتے ہیں، اس وقت اس کو من جانب اللہ بہت سے امور منکشف ہوتے ہیں تفصیل کے لیے حجۃ الاسلام امام غزالی قدس اللہ سرّہٗ کا رسالہ المنقذ من الضلال مطالعہ فرمائیں۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح غیبی امور کے انکشاف کا اعلیٰ ترین ذریعہ وحی نبوت ہے اسی طرح غیبی امور کے انکشاف کا ادنیٰ ترین ذریعہ رویائے صادقہ ہے۔ اور یہ رویائے صالحہ وحی نبوت کا ایک نمونہ ہے۔ اسی سے انبیاء کرام کی نبوت کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ دلائل ابی نعیم میں باسناد حسن عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد علقمہ بن قیس سے مرسلاً مروی ہے کہ اول انبیاء علیہم السلام کو خواب دکھلائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب سچے خوابوں سے ان کے قلوب مطمئن ہو جاتے ہیں تب بحالتِ بیداری ان پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے۔ (فتح الباری۔ ج ۱ صفحہ باب کیف کان بدء الوحی)۔ جیسے یوسف علیہ السلام کو نبوت سے پہلے ایک عجیب و غریب خواب دکھلایا گیا۔ اور اسی وجہ سے کہ رویائے صالحہ وحی نبوت کا ایک نمونہ ہے، حدیث میں ہے کہ رویائے صالحہ نبوت کا ایک جزء ہے۔ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا خواب تو ہمیشہ سچا ہی ہوتا ہے، حضرات انبیاء کے خواب میں کذب کا امکان بھی نہیں۔ البتہ صالحین کے خواب میں صدق غالب رہتا ہے، شاذ و نادر ان کا خواب از قبیل اضغاث احلام ہوتا ہے فساق

وتجار کے خواب اکثر اضغاث احلام ہوتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرۃؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

اصدقھم رؤیا اصدقھم حدیثاً جو شخص اپنی بات میں سب سے زیادہ سچا ہے وہی خواب میں بھی سب سے زیادہ سچا ہے۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ خواب کے صادق ہونے میں بیداری کے صدق کو خاص دخل ہے۔ اور جو شخص جتنا زائد صادق الکلام ہے اسی قدر نبوت سے قریب ہے اور جس درجہ صدق سے دور ہے اتنا ہی نبوت سے دور ہے۔ اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہ ارشاد فرمایا کہ رویائے صالحہ نبوت کا چھبیسواں جزء ہے، اور کبھی یہ فرمایا کہ چالیسواں جزء ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ پینتالیسواں جزء ہے، ایک اور حدیث میں ہے کہ پچاسواں جزء ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ سترواں جزء ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ چھہترواں جزء ہے۔ امام غزالی قدس اللہ سرہٗ احیاء العلوم کی کتاب الفقر والزہد میں فرماتے ہیں کہ حاشا ان مختلف کلمات کو یہ نہ سمجھو کہ باہم متعارض اور مضطرب ہیں بلکہ ان مختلف کلمات سے اختلاف مراتب کی طرف اشارہ سمجھو کہ خواب دیکھنے والے مختلف المراتب ہیں۔

صدیقین کے خواب کو نبوت سے وہی نسبت ہوگی جو ایک کو چھبیس سے ہے۔ اور کسی کے خواب کو نبوت سے وہ نسبت ہوگی جو ایک کو چالیس یا پچاس یا ستر یا چھہتر سے ہے۔ (فتح الباری ج ۱۲ ص ۳۱۹ تا ص ۳۲۴۔ کتاب التعبیر باب رؤیا الصالحین)

اور ابوہریرۃؓ کی حدیث (اصدقھم رؤیا اصدقھم حدیثا) جس کو ہم ابھی نقل کر چکے ہیں) وہ بھی اسی اختلاف مراتب کی طرف مشیر معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ افعل التفضیل کا استعمال اسی محل پر مناسب ہے کہ جہاں مراتب اور درجات مختلف اور متفاوت ہوں۔ حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل سے صراحۃً منقول ہے کہ رؤیائے صالحہ کے جزء نبوت ہونے میں جس قدر بھی روایتیں مروی ہیں۔ وہ سب اختلاف مراتب پر محمول ہیں۔ (مدارج السالکین ج ۱ ص ۲۸)

رہا یہ سوال کہ رویائے صالحہ کے جزءِ نبوت ہونے کے کیا معنی ہیں، حضرات اہلِ علم اس کے حل کے لیے فتح الباری باب المبشرات ج ۱۲ صفحہ ۲۳۱ تا صفحہ ۲۳۲ سے مراجعت کریں اور بعد ازاں اپنے طلبہ اور متوسلین کو سمجھائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو اس فعلِ خیر کی جزاءِ خیر عطا فرمائے۔ دلالت علی الخیر کے اجر کا یہ ناچیز بھی اپنے پروردگار سے امیدوار ہے۔ تطویل کے اندیشے نے اس وقت پہلوتہی پر مجبور کیا۔ لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرًا۔

اب اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ بخاری اور مسلم میں ام المومنین عائشہ صدیقہ بنت صدیق سے مروی ہے :۔

اوّل ما بدأ به رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرؤیا الصالحۃ فی النوم فکان لا یریٰ رؤیا اِلّا جاءت مثل فلق الصبح۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء رؤیائے صالحہ سے ہوئی جو خواب بھی دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہو کر رہتا۔

ابن ابی جمرہ فرماتے ہیں کہ رویائے صالحہ کو صبح کے ساتھ اس لیے تشبیہ دی گئی کہ ہنوز آفتابِ نبوت نے طلوع نہ کیا تھا جس طرح صبح کی روشنی طلوعِ آفتاب کا دیباچہ ہے اسی طرح رویائے صالحہ آفتابِ نبوت و رسالت کے طلوع کا دیباچہ اور پیش خیمہ تھا۔

رویائے صادقہ کی صبح صادق خبر دے رہی تھی کہ عنقریب آفتابِ نبوت طلوع کرنے والا ہے اور جس طرح صبح کی روشنی آناً فاناً بڑھتی رہتی ہے اسی طرح رویائے صالحہ اور صادقہ کی روشنی بھی آناً فاناً بڑھتی رہی، یہاں تک کہ آفتابِ نبوت و رسالت فاران کی چوٹیوں سے جلوہ گر ہوا جو قلب کے بصیر اور بینا تھے مثلاً ابوبکر، وہ سامنے آئے اور آفتابِ نبوت کے انوار و تجلیات سے مستفید ہوئے اور جو کور باطن اور خفاش دل تھے، جیسے ابوجہل، آفتاب کے طلوع ہوتے ہی خفاش کی طرح اُن کی آنکھیں بند ہوگئیں اور نبوت و رسالت کے آفتاب عالم تاب کی تمازت کی تاب نہ لاسکے

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ‌‌ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

ے چہرۂ آفتاب خود نمایش است بے نصیبی نصیبِ خفاش است

باقی لوگ ابوبکر، ابوجہل کے بین بین تھے۔ اپنی اپنی بصیرت اور نورِ قلبی کے موافق ہر شخص آفتابِ نبوت سے مستفید ہوا۔ (فتح الباری ج ۱۲ ص ۳۱۱، کتاب التعبیر)

ام المومنین عائشہؓ فرماتی ہیں:۔

ثم حُبّبَ الیہ الخلاء وکان یخلو بغارِ حراء	پھر آپ کو خلوت اور تنہائی محبوب بنا دی گئی۔ آپ غارِ حراء میں جاکر خلوت فرماتے۔

ام المومنین نے حُبّبَ کو بصیغۂ مجہول بظاہر اس لیے ذکر فرمایا کہ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کیا سبب اور کیا داعی تھا کہ جس نے خلوت اور عزلت کو آپ کے لیے محبوب بنا دیا۔ وہ کوئی امرِ باطنی اور غیبی تھا کہ جس نے خلوت و تنہائی پر آپ کو مجبور کر دیا۔ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ وہ کیا تھا۔ اور ہم کے حق میں وہ سراسر مجہول ہے۔ اس لیے ام المومنین نے اس کو بصیغۂ مجہول ذکر فرمایا۔

حق جل شانہ جب کسی کے ساتھ خاص رحمت کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے قلب میں خلوت وعزلت کا داعیہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ شانہ اصحابِ کہف کے قصہ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنشُرْ لَكُمْ رَبُّكُم مِّن رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا۔	اور جب ان کافروں سے اور ان کے تمام معبودوں سے سوائے اللہ کے الگ ہو جاؤ تو ایک غار میں جاکر ٹھکانہ بناؤ تاکہ اطمینان سے اللہ کی عبادت کر سکو۔ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمتیں برسائے گا اور ہر کام میں تمہارے لیے سہولت پیدا فرما دے گا۔

یہ ضروری نہیں کہ خلوت وعزلت سے نبوت مل جائے اس لیے کہ نبوت اور رسالت کوئی اکتسابی شے نہیں وہ جس کو چاہے نبی اور رسول بنائے واللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ

تبارک اللہ ما وحی بمکتسب ولا نبی علی غیب بمتہم

ہاں جس کو وہ خود اپنی رحمت سے نبی اور رسول بنانا چاہتے ہیں۔ خلوت وعزلت کو خاص

طور پر اس کے لیے محبوب بنا دیتے ہیں۔ اور یہ خلوت و عزلت ان کے حق میں نبوت و رسالت کا دیباچہ ہوتی ہے جیسا کہ رویائے صالحہ فقط اُن حضرات کے لیے نبوت و رسالت کا پیش خیمہ ہوتا ہے جن کے لیے منصب نبوت پر فائز ہونا علم الٰہی میں مقدر ہو چکا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ جس کو رویائے صالحہ اور سچے خواب نظر آنے لگیں وہ نبی ہو جائے گا۔

وقال الله تعالیٰ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۔	پس جب ابراہیم علیہ السلام کافروں سے اور سوائے خدا کے ان کے تمام معبودوں سے الگ ہو گئے تو ہم نے ابراہیم کو اسحاق جیسا بیٹا اور یعقوب جیسا پوتا عطا کیا اور ہر ایک کو نبی بنایا۔

اس آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب کا منصبِ نبوت پر فائز ہونا عزلتِ ابراہیمی کی برکات میں سے تھا۔

اسی طرح آپ بھی غارِ حرا میں جا کر اعتکاف فرماتے اور کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے اور وہاں رہ کر اللہ کی عبادت اور بندگی کرتے۔ کسی حدیث میں آپ کی عبادت کی کیفیت مذکور نہیں بعض علماء فرماتے ہیں کہ ذکرِ الٰہی اور مراقبہ اور تفکر اور تدبّر یہ آپ کی عبادت تھی۔ علاوہ ازیں فساق و فجار مشرکین اور کفار سے علیحدہ رہنا یہ خود مستقل عبادت ہے (آخر ہجرت جس کی مدح و ثنا سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے وہ کیا ہے۔ وہ خدا اور رسول کے دشمنوں سے علیحدگی ہی کا تو نام ہے) اور جب توشہ ختم ہو جاتا تو پھر گھر واپس آکر توشہ لے جاتے اور عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ (زرقانی - ج ۱ صفحہ ۲۱)

له بین القوسین جو عبارت ہے وہ مؤلف کی طرف سے ہے اس لیے اس کو علامہ زرقانی کے کلام سے ممتاز کر دیا گیا۔ جس دلیل سے اللہ عزوجل کے عباد مخلصین کا دیکھنا موجب خیر و برکت ہے اسی دلیل سے اعداء اللہ کا دیکھنا سلیم طبیعتوں کے لیے موجب کدورت اور باعث ظلمت ہے کیا ہارون اور موسیٰ بن عمران اور فرعون و ہامان۔ اور محمد رسول اللہ اور ابوجہل عدو اللہ۔ ابوبکر صدیق اور مسیلمہ کذاب کا دیکھنا برابر ہے؟ حاشا ثم حاشا

والمختار عندنا انه کان یعمل بما ظهر له من الکشف الصادق من شریعة ابراهیم وغیره کما فی الدر المختار - ج ۱ ص ۲۶۳" اور فقہاء حنفیہ کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ آپ کو کشفِ صادق اور الہام صحیح سے جو ظاہر اور منکشف ہوتا کہ یہ حضرت ابراہیم یا اور کسی نبی کی شریعت ہے آپ اُسکے مطابق عمل فرماتے" جیسا کہ بعض روایات میں بجائے فَيَتَحَنَّثُ کے فَيَتَحَنَّفُ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ابراہیم حنیف کے طریقہ پر چلتے تھے وہ اس کی تائید کرتا ہے کہ آپ ملّتِ حنیفیہ کے مطابق اپنے کشف اور الہام سے عمل کرتے تھے۔

آفتابِ رسالت کا فاران کی چوٹیوں سے طلوع یہاں تک کہ جب عمر شریف چالیس[۱] سال کو پہنچی تو حسب معمول آپ ایک روز غار حراء میں تشریف فرما تھے کہ دفعتہً ایک فرشتہ غار کے اندر آیا اور آپ سے یہ کہا " اِقْرَأْ " پڑھیے "۔ آپ نے فرمایا: مَا أَنَا بِقَارِئٍ "میں پڑھ نہیں سکتا"۔ اس پر فرشتہ نے پکڑ کر مجھ کو اس شدت سے دبایا کہ میری مشقت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور اُس کے بعد چھوڑ دیا، اور پھر کہا اِقْرَأْ - میں نے پھر وہی جواب دیا: مَا أَنَا بِقَارِئٍ "میں پڑھ نہیں سکتا"۔ فرشتہ نے مجھ کو پھر اسی شدت کے ساتھ دبایا اور پھر چھوڑ دیا اور کہا اِقْرَأْ ، میں نے پھر وہی جواب دیا مَا أَنَا بِقَارِئٍ

"ما انا بقارئ" کے بظاہر معنی یہ ہیں کہ میں پڑھا ہوا نہیں، یعنی اُمّی ہوں۔ اس معنی میں اشکال یہ ہے کہ قرأت یعنی زبان سے پڑھنا اُمّیت کے منافی نہیں۔ اُمّی شخص بھی کسی کی تعلیم و تلقین سے قرأت اور تلفظ ادا کر سکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ فصاحت اور بلاغت اس کی خادم ہو۔ اُمّیت کتابت کے منافی ہے۔ اُمّی شخص لکھی ہوئی تحریر کو نہیں پڑھ سکتا۔ لیکن زبانی تعلیم و تلقین سے تلقین کردہ الفاظ

---

[۱] چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہونا ابن عباس اور انس بن مالکؓ سے صحیح بخاری میں مذکور ہے اور ایسا ہی جبیر بن مطعمؓ اور قباث بن اشیم صحابی۔ اور عطاء اور سعید بن المسیب سے مروی ہے تو عیون الاثر۔ وزرقانی ج ۱ ص ۲۰۷)

[۲] اس حدیث کو امام بخاری نے بدء الوحی اور کتاب التعبیر اور کتاب التفسیر میں ذکر کیا ہے حتیٰ بلغ منی الجھد کا لفظ مرف ایک ہی اور دوسری بار کے ساتھ ذکر کیا ہے لیکن کتاب التفسیر اور کتاب التعبیر میں تیسری بار کے ساتھ بھی ذکر کیا ہے۔

کی قرأت کر سکتا ہے۔ پس اگر جبریل امین کوئی لکھی ہوئی تحریر لے کر آئے تھے کہ جس میں یہ آیتیں لکھی ہوئی تھیں اور اس کی نسبت کہتے تھے کہ اِقرأ یعنی پڑھو تو پھر اس کے جواب میں ما انا بقاریٔ کہنا ظاہر اور واجب ہے۔ جیسا کہ بعض روایات[1] میں ہے کہ جبریل ایک حریری صحیفہ لے کر آئے جو جواہرات سے مرصّع تھا اور وہ صحیفہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ اِقرأ یعنی اس حریری صحیفہ کو پڑھیے۔ آپ نے فرمایا ما انا بقاریٔ۔ یعنی میں امی ہوں لکھی ہوئی تحریر کو نہیں پڑھ سکتا۔

بعض[2] مفسرین کا قول ہے کہ الٓمٓ ذالک الکتاب لاریب فیہ میں اسی کتاب کی طرف اشارہ ہے جس کو جبریل امین لے کر آئے تھے۔

اور اگر جبریل امین کوئی تحریر نہیں لائے تھے اور اقرأ سے کسی لکھی ہوئی تحریر کا پڑھنا مطلوب نہ تھا بلکہ محض زبان سے قرأت اور تلفظ مطلوب تھا تو اس صورت میں ما انا بقاریٔ کے یہ معنی نہیں کہ میں اُمی ہوں پڑھا ہوا نہیں، بلکہ معنی یہ ہیں کہ وحی کی ہیبت اور دہشت کی وجہ سے پڑھ نہیں سکتا۔ رویت مَلک اور مشاہدۂ انوارِ وحی کی وجہ سے قلب پر اس درجہ ہیبت اور دہشت طاری ہے کہ زبان اٹھتی نہیں کس طرح پڑھوں؟۔ جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے یہ فرمایا کہ کَیْفَ اَقْرَأُ۔ اس بنا پر ہم نے ما انا بقاریٔ کا ترجمہ یہ کیا۔ کہ میں پڑھ نہیں سکتا۔ جو اس معنی کے بھی مناسب ہے اور پہلے معنی کے ساتھ بھی درست ہو سکتا ہے۔ ھٰذا توضیح ما افادہ الشیخ عبد الحق المحدث الدھلوی فی اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۵۳۴ و مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۴۳)

فرشتہ نے پھر تیسری بار مجھ کو پکڑا اور اسی شدت کے ساتھ دبایا اور چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ پڑھو

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ — آپ اپنے پروردگار کے نام کی مدد سے پڑھیے

---

[1] زرقانی شرح مواہب ج ۱ ص ۲۱۸ میں ہے قد روی ابن اسحٰق فی مرسل عبید بن عمیر جاءنی جبرئیل بنمط من دیباج فیہ کتاب

[2] بعض مفسرین کا قول اشعۃ اللمعات میں نہیں بلکہ روض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام میں مذکور ہے۔

الانسان من علق اقرأ وربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم[1] جو خالق ہے تمام کائنات کا، خصوصاً انسان کا کہ جس کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ آپ پڑھیے آپ کا رب بہت ہی کریم ہے جس نے قلم سے علم سکھایا اور انسان کو وہ چیزیں تبلائیں کہ جن کو وہ نہیں جانتا تھا۔

بعد ازاں آپ گھر تشریف لائے اور بدن مبارک پر لرزہ اور کپکپی تھی۔

آتے ہی حضرت خدیجہ سے فرمایا زملونی زملونی ۔ مجھ کو کچھ اڑھاؤ، مجھ کو کچھ اڑھاؤ۔ جب کچھ دیر کے بعد وہ گھبراہٹ اور پریشانی دور ہوئی تو تمام واقعہ حضرت خدیجہ سے بیان کیا۔ اور یہ کہا کہ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ میری جان نہ نکل جائے۔ چونکہ وحی اور فرشتہ کے انوار و تجلیات کا حضور کی بشریت پر دفعتہ نزول اور ورود ہوا، اس لیے وحی کی عظمت اور جلال سے آپ کو یہ خیال ہوا کہ اگر وحی کی یہی شدت رہی تو عجب نہیں کہ میری بشریت وحی کے اس ثقل اور بوجھ کو نہ برداشت کر سکے اور بار نبوت سے مغلوب ہو کر فنا ہو جائے، اور اس آیت میں اسی ثقل کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا اے محمد ہم تم پر ایک ثقیل اور گراں کلام نازل کریں گے۔

سوار ہونے کی حالت میں اگر آپ پر وحی نازل ہو جاتی تو ناقہ وحی کے بوجھ سے مجبوراً بیٹھ جاتی تھی۔ زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ ایک بار آپ کی ران میری ران پر تھی کہ وحی نازل ہو گئی۔ اسوقت آپکی ران اس درجہ ثقیل معلوم ہوئی کہ اپنی ران کے چور چور ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا۔

ایک معمولی واقعہ بھی اگر خلاف طبع پیش آجاتا ہے تو انسان پریشان ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ایسا عظیم الشان واقعہ پیش آئے کہ جو وہم و گمان سے بھی بالا ہو، اس سے گھبرا جانا کوئی مستبعد نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو جب حق جل شانہ کی طرف سے معجزۂ عصا عطا ہوا۔ اور حکم ہوا کہ اے موسیٰ اپنا عصا زمین پر ڈال دو۔ جب دیکھا کہ وہ تو سانپ بن کر چلنے لگا تو موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ڈر کر اس قدر تیز بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس وقت آواز آئی:- اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ اے موسیٰ

---

[1] مَا لَمْ یَعْلَمْ تک پڑھنا کتاب التفسیر اور کتاب التعبیر میں مذکور ہے۔ بدء الوحی کی روایت میں فقط وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ تک پڑھنا مذکور ہے۔

واپس آؤ، ڈرو مت تم بالکل مامون ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کا ڈرنا اور بھاگنا طبیعت بشریہ کا اقتضا تھا خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفًا شک اور تردد کی وجہ سے نہ تھا اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرعوبیت اور پریشانی بھی فقط اس بنا پر تھی کہ دفعۃً نبوت اور وحی کا بارگراں آ پڑا۔ کسی تردد اور شک کی بنا پر یہ پریشانی نہ تھی۔

بشریت پر دفعۃً ملکیت کے غلبہ سے آپ کا مرعوب اور خوف زدہ ہو جانا کوئی مستبعد نہیں۔ رفتہ رفتہ جب ملائکہ کی آمد و رفت سے آپ کی بشریت ملکیت سے مانوس ہوگئی تو یہ خوف جاتا رہا؛ چانک بار نبوت پڑ جانے سے آپ گھبرا گئے اور آپ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں اس بار سے میری روح نہ پرواز کر جائے۔ معاذ اللہ نبوت و رسالت میں کوئی شک اور تردد نہ تھا۔ اس لیے کہ نزولِ جبریل اور مشاہدۂ انوار و تجلیات کے بعد نبوت میں شک اور تردد محال ہے۔

ایک مرسل روایت میں ہے کہ جبریل امین آئے اور میرا سینہ چاک کیا اور ایک نہایت عمدہ مسند پر بٹھلایا جو یواقیت اور جواہرات سے مرصع تھی۔

ثم استعلن له جبرئيل فبشّره برسالة الله حتى اطمأن النبى صلى الله عليه وسلم ثم قال له اقرأ فقال كيف اقرأ فقال اقرأ باسم ربك الذى خلق الى قوله مالم يعلم

اور منجانب اللہ آپ کو منصب نبوت و رسالت کی بشارت دی۔ یہاں تک کہ آپ مطمئن ہو گئے۔ پھر کہا کہ پڑھو۔ آپ نے فرمایا کس طرح پڑھوں۔ جبریل نے کہا اقرأ باسم ربک الذی خلق ۔۔۔ مالم یعلم تک۔

فقبل الرسول رسالة ربه وانصرف فجعل لا يمر على شجر ولا حجر الا سلّم عليه فرجع مسرورا الى اهله موقنا قد رأى امراً عظيما (الحديث)

آپ نے اللہ کے پیغام کو قبول کیا اور واپس ہوئے راستہ میں جس شجر اور حجر پر آپ کا گذر ہوتا وہ آپ کو السلام علیک یا رسول اللہ کہتا۔ پس اس طرح آپ شاداں و فرحاں اپنے گھر واپس آئے اور یہ یقین کیے ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شیٔ عظیم عطا فرمائی۔ یعنی نبوت و رسالت۔

یہ روایت دلائل بیہقی اور دلائل ابی نعیم میں بطریق موسیٰ بن عقبہ مروی ہے (خصائص کبریٰ ج ۱ ص ۹۳)

اور یہ روایت عیون الاثر میں حافظ ابو بشر دولابی کی سند سے مذکور ہے ۔ غرض یہ کہ غار حراء سے آتے کر گھر تک اس شان سے پہنچے کہ ہر شجر اور حجر اور ہر در و دیوار السلام علیک یا رسول اللہ کہہ رہا تھا ۔ کیا اس سننے کے بعد بھی نبوت میں کوئی شک اور تردد ہو سکتا ہے ۔

حافظ عسقلانی فرماتے ہیں ۔ عبید بن عمیر کی مرسل روایت میں ہے کہ جبرئیل آئے اور مجھ کو ایک مسند پر بٹھلایا کہ جو جواہرات سے مرصع تھی ۔ اور زہری کی مرسل روایت میں ہے کہ مجھ کو ایسی عمدہ مسند پر بٹھلایا جس کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا ۔ (فتح الباری ج ۱۲ ص ۳۱۳)

غرض یہ کہ آپ گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے تمام واقعہ بیان کر کے فرمایا کہ مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہے تو حضرت خدیجہؓ نے یہ فرمایا: آپ کو مبارک ہو ۔ آپ ہرگز نہ ڈریے ۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے ، خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا ۔ آپ تو صلۂ رحمی کرتے ہیں ۔ آپ کی صلۂ رحمی بالکل محقق ہے[1] ۔ ہمیشہ آپ سچ بولتے ہیں ۔ لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں ، یعنی دوسروں کے قرضے اپنے سر رکھتے ہیں ۔ اور ناداروں کی خبر گیری فرماتے ہیں ، امین ہیں لوگوں کی امانتیں ادا کرتے ہیں[2] ۔ مہمانوں کی ضیافت کا حق ادا کرتے ہیں ۔ حق بجانب امور میں آپ ہمیشہ معین اور مددگار رہتے ہیں "

یہ روایت بخاری اور مسلم کی ہے ۔ ابن جریر کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے یہ بھی فرمایا : مَا اَتَیْتَ فَاحِشَۃً قَطُّ " آپ تو کبھی کسی فاحشہ کے پاس بھی نہیں پھٹکے " (تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۰۶)

خلاصہ یہ کہ جو شخص ایسے محاسن اور کمالات اور ایسے محامد اور پاکیزہ صفات اور ایسے اخلاق و شمائل اور ایسے معالی امور فضائل کا مخزن اور معدن ہو اس کی رسوائی ناممکن ہے ۔ وہ نہ دنیا میں رسوا ہو سکتا ہے نہ آخرت میں ۔ حق تعالیٰ شانہ جس کو اپنی رحمت سے یہ محاسن اور کمالات عطا فرماتے ہیں اس کو ہر بلا اور ہر آفت سے بھی ضرور محفوظ رکھتے ہیں ۔

ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دی اور یہ کہا کہ قسم ہے اس

---

[1] یہ ترجمہ لفظ اِن کا ہے جو تحقیق کے لیے وضع ہوا ہے اس لیے کہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں : اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ

[2] آپ کی یہ صفت کتاب التعبیر کی روایت میں ہے ، بدء الوحی کی روایت میں بیان سے رہ گئی ۔

ذات پاک کی جس کے قبضہ میں خدیجہؓ کی جان ہے میں توی امید رکھتی ہوں کہ آپ اس امت کے نبی ہوں گے۔ (سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص۱۸۱)

وَاَخْبَرَهَا بما جاء به فقالت اُبْشِرْ فوالله لا يفعل الله بك الا خيرا فاقبل الذي جاءك من الله فانه حق وابشر فانك رسول الله حقا۔

(رواہ البیہقی فی الدلائل من طریق ابی میسرہؓ مرسلاً)

آپ نے تمام واقعہ حضرت خدیجہ سے بیان کیا حضرت خدیجہ نے کہا مبارک ہو اور آپ کو بشارت ہو۔ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ سوائے خیر اور بھلائی کے کچھ نہ کرے گا۔ جو منصب اللہ کی جانب سے آپ کے پاس آیا ہے اس کو قبول کیجیے وہ بلاشبہ حق ہے اور پھر کہتی ہوں کہ آپ کو بشارت ہو۔ آپ یقیناً اللہ کے رسول برحق ہیں۔ (فتح الباری ج ۱۲ ص۳۱۶ کتاب التعبیر)

حافظ عسقلانی اس روایت کو نقل کرکے فرماتے ہیں کہ یہ روایت صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہے کہ علی الاطلاق سب سے پہلے حضرت خدیجہ ایمان لائیں۔

بعدازاں حضرت خدیجہ تنہا اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو توریت اور انجیل کے بڑے زبردست عالم تھے اور سریانی زبان سے عربی زبان میں انجیل کا ترجمہ کرتے تھے اور زمانۂ جاہلیت میں بُت پرستی سے بیزار ہو کر نصرانی بن گئے تھے اور اس وقت بہت بوڑھے اور نابینا ہو چکے تھے۔ اُن سے یہ تمام واقعہ بیان کیا۔ ورقہ نے سُنکر یہ کہا۔

لئن كنتِ صدقتني انه ليأتيه ناموس[۲] عيسى

اگر تو سچ کہتی ہے تو تحقیق ان کے پاس وہی فرشتہ آیا ہے جو عیسٰی علیہ السلام کے پاس آتا تھا۔

یہ روایت دلائل ابی نعیم میں باسنادِ حسن مذکور ہے (فتح الباری ج ۱ ص۲۵)

---

[۱] ابو میسرہ کا نام عمرو بن شرحبیل ہے۔ بڑے جلیل القدر تابعی ہیں۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں۔ بخاری اور مسلم، ابوداؤد اور ترمذی اور نسائی نے ان سے روایت لی ہے۔

[۲] خیر کی خبر لانے والے کو ناموس کہتے ہیں۔ اور شر کی خبر لانے والے کو جاسوس کہتے ہیں۔ (فتح الباری ج ۱ ص۲۴)

اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپ کو اپنے ہمراہ لے کر ورقہ کے پاس گئیں۔ اور یہ کہا آے میرے چچا زاد بھائی ذرا اپنے بھتیجے کا حال (یعنی خود اُن کی زبان سے) سنیے۔ ورقہ نے آپ سے مخاطب ہو کر کہا " اے بھتیجے تبلاؤ کیا دیکھا " آپ نے تمام واقعہ بیان کیا۔

فلما سمع کلامہ[2] ایقن بالحق و اعترف بہ (فتح الباری ج ۱۲ ص۳۱۶ کتاب التعبیر)

ورقہ نے جب آپ کا کلام سنا تو سنتے ہی حق کا یقین آگیا (کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں۔ وہ بالکل حق ہے) اور ورقہ نے اس حق کا اعتراف کیا (اور اس کو تسلیم کیا)

ورقہ نے آپ کا تمام حال سُنکر کہا کہ یہ وہی ناموس (فرشتہ) ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اُترتا تھا۔ کاش میں تمہارے زمانہ پیغمبری میں قوی اور توانا ہوتا جبکہ تمہاری قوم تم کو وطن سے نکالے گی۔ یا کم از کم زندہ ہی ہوتا۔ آپ نے بہت تعجب[3] سے فرمایا "کیا وہ مجھ کو نکالیں گے؟" ورقہ نے کہا " ایک تم ہی پر موقوف نہیں جو شخص بھی پیغمبر ہو کر اللہ کا کلام اور اُس کا پیام لے کر آیا لوگ اس کے دشمن ہوتے۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو نہایت زور سے آپ کی مدد کرونگا" کچھ زیادہ دن گذرنے نہ پائے کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے۔ اور

[1] بین القوسین میں یعنی الخ کا اضافہ اس لیے کیا گیا تاکہ بخاری اور دلائل ابی نعیم کی روایت میں تعارض کا توہم نہ ہو۔

[2] سَمِعَ اور اَیقَنَ اور اِعتَرَفَ کی تمام ضمائر ورقہ کی طرف راجع ہیں۔ علامہ شبلی نے تمام ضمائر کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع سمجھ کر اس طرح ترجمہ کیا " جب آپ نے ورقہ کا کلام سنا تو آپ کو حق کا یقین آگیا اور آپ نے اس کا اعتراف کیا " (سیرۃ النبی ج ۱ ص۱۸۹ تقطیع خورد)۔ یہ غلط ہے۔ حضور کو تو اپنی نبوت و رسالت کا یقین نزول وحی اور مشاہدہ جبریل ہی سے ہو چکا تھا۔ البتہ ورقہ کو آپ کا کلام سننے کے بعد آپ کی نبوت کا یقین آیا اور حق کا اعتراف کیا۔

[3] تعجب کی وجہ ظاہر تھی کہ اوّل تو کوئی قصور نہیں۔ پھر یہ کہ ایسے اخلاق کے ہوتے ہوئے نکالا جانا سراسر تعجب ہے انہی اخلاق کی بنا پر ابن دغنہ نے ابوبکرؓ سے کہا تھا کہ تجھ جیسا آدمی نہیں نکالا جا سکتا (مفصل واقعہ انشاءاللہ آئندہ آئیگا)

نیز جس کو دل و جان سے صادق و امین مانتے ہوں، اس کو نکالنا بڑے تعجب کی بات ہے۔

ابو میسرہ کی ایک مرسل روایت میں ہے کہ ورقہ نے یہ کہا:

ابشر فانا اشهد انك الذى بشر به ابن مریم وانك على مثل ناموس موسى وانك نبى مرسل وانك تؤمر بالجهاد (فتح الباری ج ۸ صـ۵۵۲ کتاب التفسیر سورۂ اقرأ - اصابہ صـ۶۳۳ ترجمہ ورقہ بن نوفل وعیون الاثر ج اصـ۴۲)	آپ کو بشارت ہو میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہی نبی ہیں جن کی حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام نے بشارت دی ہے اور آپ مثل موسیٰ علیہ السلام کے نبی مرسل ہیں اور آپ کو عنقریب اللہ کی طرف سے جہاد کا حکم کیا جائیگا۔

چونکہ آپ بھی موسیٰ علیہ السلام کی طرح نبی الجہاد ہیں۔ اور شریعت موسویہ کی طرح آپ کی شریعت بھی حدود و تعزیرات جہاد و قصاص، حلال وحرام کے احکام پر علیٰ وجہ الاتم مشتمل ہے اس لیے اس وقت ورقہ نے باوجود نصرانی ہونے کے یہ کہا کہ یہ وہی ناموس (فرشتہ) ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتا تھا، اور جس وقت اول بار حضرت خدیجہؓ نے آپ کے غیاب میں ورقہ سے آپ کا حال بیان کیا تو اس وقت ورقہ نے نصرانی ہونے کے باعث آپ کے ناموس (فرشتہ) کو ناموس عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی۔ (فتح الباری ج ا صـ۲۴)

ابن ہشام کی روایت میں ہے کہ چلتے وقت ورقہ نے آپ کے سر کو بوسہ دیا (عیون الاثر ج اصـ۸۵)

آپ گھر واپس آگئے اور وحی کا آنا چند روز کے لیے رُک گیا[1]، تا آنکہ دل سے گذشتہ دہشت اور خوف دُور ہو جائے۔ اور آئندہ وحی کا شوق اور انتظار قلب میں پیدا ہو جائے۔

دیر ست کہ دلدار پیامے نفرستاد ‌ ‌ ‌ ‌ ننوشت سلامے و کلامے نفرستاد

وحی کے رُک جانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر حزن و ملال ہُوا کہ بار بار پہاڑ پر جاتے کہ اپنے کو پہاڑ کی چوٹی پر سے گرا دیں

بردلِ سالک ہزاراں غم بود ‌ ‌ ‌ ‌ گر ز باغ دل خلالے کم بود

---

[1] وحی کے رُک جانے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کا نازل ہونا چند روز کے لیے بند ہو گیا۔ اور یہ مطلب نہیں کہ جبرئیل کا آنا بند ہو گیا۔ جبریل امین کی آمد و رفت برابر جاری رہی۔ عمدۃ القاری ج اصـ۶۴

ہجر سے بڑھ کر مصیبت کچھ نہیں　　اس سے بہتر ہے کہ مر جاؤں کہیں

مگر آپ جب ایسا ارادہ فرماتے تو فوراً جبریل امین ظاہر ہوتے اور یہ فرماتے:۔

یا محمد انک رسول اللہ حقاً　　اے محمدؐ! آپ یقیناً بلا شبہ اللہ کے رسول برحق ہیں۔

یہ سن کر آپ کے قلب کو سکون ہو جاتا۔ (بخاری و مسلم)

ایک بار حضرت خدیجہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ اگر ممکن ہو تو جس وقت وہ ناموس آپ کے پاس آئے تو مجھ کو ضرور مطلع فرمائیں۔

چنانچہ جبرئیل امین جب آپ کے پاس آئے تو حسب وعدہ آپ نے حضرت خدیجہؓ کو اطلاع کی۔ حضرت خدیجہ نے عرض کیا کہ "آپ میرے آغوش میں آجائیں" جب آپ خدیجہ کے آغوش میں آگئے تو حضرت خدیجہ نے اپنا سر کھول دیا اور آپ سے دریافت کیا کہ کیا آپ اس وقت بھی جبرئیل کو دیکھتے ہیں"؟ آپ نے فرمایا "نہیں" حضرت خدیجہؓ نے کہا "آپ کو بشارت ہو۔ خدا کی قسم یہ فرشتہ ہے، شیطان نہیں۔

اس روایت کو محمد بن اسحاق نے اسمٰعیل بن حکیم سے مرسلاً روایت کیا ہے (سیرۃ ابن ہشام ج ۱۔ صـــ۸۲ ۔ فتح الباری ج ۸ صـــ۵۵۳ کتاب التفسیر سورۃ اقرأ)

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت خدیجہ نے فرمایا "آپ کو مبارک ہو، یہ فرشتہ ہے۔ اگر شیطان ہوتا تو نہ شرماتا۔ (رواہ ابو نعیم فی الدلائل بسند ضعیف عن عائشۃ رضی اللہ عنہا۔ اصابہ ج ۴ صـــ۲۸۱ ترجمہ خدیجۃ الکبریٰؓ)

خلاصہ یہ کہ حضرت خدیجہؓ کا استدلال آپ کی نبوت و رسالت پر عقلی تھا کہ ایسے محاسن وشمائل اور کمالات وفضائل کا منبع اور سرچشمہ نبی ہی کی ذات با برکات ہو سکتی ہے اور ورقہ کا استدلال نقلی تھا کہ یہ وہی نبی و رسول ہیں کہ جن کی حضرت مسیحؑ بن مریم نے بشارت دی ہے۔

سلیمان تیمی اور موسیٰ بن عقبہ نے اپنی کتاب المغازی میں ذکر کیا ہے کہ حضرت خدیجہ پہلے عداس[1]

---

[1] عداسؓ۔ عتبہ بن ربیعہ کے غلام تھے۔ شہر نینویٰ کے باشندہ تھے۔ جہاں یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے مذہب ان کا نصرانی تھا۔ بعد میں مشرف باسلام ہوئے۔ اصابہ ج ۲ صـــ۴۶۶ ترجمۂ عداس

کے پاس گئیں اور جبرئیل کا آنا بیان کیا۔ عداس نے جبرئیل کا نام سنتے ہی یہ کہا قدوس، قدوس، یعنی سبحان اللہ سبحان اللہ، اس بُت پرستوں کی سرزمین میں جبرئیل کا کیا ذکر، وہ تو اللہ کے امین ہیں۔ اس کے اور اس کے پیغمبروں کے مابین سفیر ہیں اور موسیٰ اور عیسیٰ کے دوست ہیں۔ بعد ازاں ورقہ کے پاس گئیں۔ (اصابہ ج ۲ ص ۴۶۷ ترجمۂ عداس۔ وزرقانی ج ۱ ص ۲۱۳۔ فتح الباری ج ۸ ص ۵۵۳ کتاب التفسیر سورۂ اقرأ۔ وعمدۃ القاری ج ۱ ص ۶۴۔ باب بدء الوحی)

بعض کتب سیر میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ بحیرا راہب کے پاس بھی گئیں اور واقعہ بیان کیا۔ بحیرا کے جواب کے الفاظ تقریباً وہی تھے کہ جو عداس کے جواب کے ہیں (روض الانف ج ۱ ص ۱۴۳)

ترمذی میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے ایک بار آپ سے عرض کیا کہ ورقہ نے آپ کی نبوت و رسالت کی تصدیق کی لیکن اعلانِ دعوت سے پہلے ہی وفات پا گئے آپ نے فرمایا میں نے ورقہ کو خواب میں دیکھا کہ سفید لباس میں ہیں اگر وہ اہل نار سے ہوتے تو کسی اور لباس میں ہوتے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۵۵۳ کتاب التفسیر سورۂ اقرأ)

مسند بزار اور مستدرک حاکم میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ورقہ کو بُرا مت کہو۔ میں نے اس کے لیے جنت میں ایک باغ یا دو باغ دیکھے (فتح الباری ج ۸ ص ۵۵۴) اور حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی شرط پر ہے (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۶۵)

فائدہ جلیلہ | حضرت خدیجہؓ کا حضور پُرنور کو کبھی ورقہ کے پاس لے جانا اور کبھی عداس کے پاس لے جانا اور آپ کا حال بیان کرنا اس سے کسی شک اور تردد کا ازالہ اور کسی علم و یقین کا حاصل کرنا مقصود نہ تھا۔ بلکہ حضور کی تسلی اور تشفی مقصود تھی کہ نزولِ وحی کی وجہ سے جو حضور پر ایک خاص خشیت اور دہشت طاری ہے وہ مبدل بہ سکون ہو جائے اور چونکہ حضرت خدیجہؓ نے حضور پُرنور سے جو نکاح کیا تھا وہ غیبی کرامتیں اور خوارق دیکھ کر اس امید پر کیا تھا کہ جس نبی آخر الزماں کی بشارتیں اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل سے بار بار سنی تھیں۔ اس کا مصداق حضور ہوں گے چنانچہ جب آپ پر وحی نازل ہوئی اور غارِ حرا سے واپس آ کر خدیجۃ الکبریٰ سے بیان کیا تو حضرت خدیجہؓ

کو سنتے ہی آپ کی نبوت کا یقین آگیا تھا۔ لیکن فرطِ مسرت اور جوشِ محبت میں مزید اطمینان کے لیے کبھی آپ کو ورقہ کے پاس اور کبھی عداس کے پاس لے جائیں کہ جس امید پر نکاح کیا تھا بحمداللہ وہ امید بر آئی۔ حضرت خدیجہؓ فقط آپ کی پریشانی سے پریشان تھیں ورنہ اپنے دل میں بے انتہا شاداں و فرحاں تھیں۔ اور حضورؐ کا مقصد بھی تسلی اور تشفی ہی تھا۔ معاذ اللہ آپ کو اپنی نبوت و رسالت میں ذرہ برابر شک اور تردد نہ تھا اور مشاہدۂ جبریل اور معائنۂ انوار و اسرار کے بعد تردد اور شک کا ہونا بھی ناممکن اور محال ہے۔ وجہ یہ تھی کہ ورقہ اگرچہ عالم تھے مگر صاحب حال اور صاحبِ کیفیت نہ تھے۔ آپ کے قلبِ مبارک پر جو وحی کی کیفیت گذر رہی تھی اس کی حقیقت اور اس کی لذت کی کیفیت تو حضور ہی کو معلوم تھی ورقہ اس کیفیت کو ذوقی طور پر نہیں جانتے تھے، ذوقاً اس سے بالکل ناآشنا تھے، بلکہ محض علمی طور پر جانتے تھے کہ حضرات انبیاء پر نزولِ وحی کے وقت یہ کیفیات گذرتی ہیں۔ اس لیے وہ آپ کی تسلی کرتے تھے اور ایسے وقت میں تسلی اور تشفی وہی کر سکتا ہے کہ جس پر یہ حالت اور کیفیت طاری نہ ہوا ور کچھ اجمالی طور پر اس قسم کی چیزوں سے باخبر ہو جیسے تیماردار بیمار کی تسلی کرتا ہے ورنہ جس پر یہ کیفیت اور یہ حالت طاری ہو گی۔ وہ خود ہی خوف زدہ اور مدہوش ہو جائے گا۔ اُسے اپنی ہی خبر نہ رہے گی وہ دوسروں کی کیا تسلی کرے گا اور عقلاً اور شرعاً یہ ضروری نہیں کہ تسلی دینے والا صاحب حال سے افضل اور اکمل یا اعلم اور افہم ہو۔ فافہم ذالک واستقم۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ وعلمہ اتم واحکم۔

انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام

(عبد الحمید)

(۳)

مغرب میں جمہوریت کے ساتھ جو نظامِ معیشت پروان چڑھا اسے ہم سرمایہ دارانہ نظام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ معاشیات کے بہت سے اساتذہ نے اپنے قیمتی لمحات اور صلاحیتوں کو صرف اس کی تاریخ ولادت معلوم کرنے میں صرف کیا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ چونکہ یہ صنعتی انقلاب (Industrial Revolution.) کی پیداوار ہے اس لیے اس کی پیدائش اٹھارویں صدی کے آخر میں ہوئی۔ اس کے برعکس دوسرے گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اگرچہ اس "طفل شریر" کے بالغ ہونے کا زمانہ انیسویں صدی ہے مگر اس کی پیدائش قرونِ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام میں ہو چکی تھی۔

جب ہم اس ساری بحث کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ سب کچھ عبث اور بیکار نظر آتا ہے۔ نظام ہائے حیات افراد کی طرح دنیا میں جنم نہیں لیتے بلکہ ان کا بروز وارتقاء درخت کی طرح ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی فنا اور بقا کے قوانین بھی مختلف ہیں۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام کے متعلق بھی تیقن کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فلاں سن میں پیدا ہوا۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ "مادیت پرستی" کا یہ "طفل شریر" انیسویں صدی میں اپنے شباب کو پہنچا۔ ایک المانوی عالم فرٹز سٹرن برگ (Fritz Sternberg) اسی خیال کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے:-

"سرمایہ دارانہ نظام کو موجودہ حالت پر پہنچنے کے لیے سالہا سال لگے۔ اس کے ارتقاء کی رفتار پہلے بہت سست تھی مگر انیسویں صدی کے آخر سے لے کر پہلی جنگ عظیم تک اس نظام نے اتنی حیرت انگیز ترقی کی کہ اس کا تسلط ساری دنیا پر قائم ہو گیا۔"[1]

---

[1] Capitalim and Socialism on Trial

اس وقت ہمارے پیش نظر اس نظام کی ارتقائی منازل کی نشان دہی نہیں بلکہ ہمارا مقصد صرف اس کی موجودہ حالت کا جائزہ لینا ہے۔ آج کل سرمایہ داری کی اصطلاح کسی ایسے نظام کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس میں پیدائش دولت کے آلات و وسائل افراد کی ذاتی ملکیت ہوں اور جو اشیاء پیدا کی جائیں اُن کی تقسیم کا کام بھی اُنہی کے ہاتھوں انجام پاتے۔ اس کے علاوہ لوگوں کی معاشی جدوجہد ہر قسم کی اخلاقی قیود سے آزاد ہو۔

آگے بڑھنے سے پیشتر ہم یہاں ایک بات کی وضاحت کر دینا نہایت ہی ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ اس نظام کو صرف ایک خاص قسم کی معاشی ہیئت خیال کرتے ہیں مگر یہ ایک شدید غلط فہمی ہے جس کا شکار بعض بڑے بڑے تعلیم یافتہ آدمی بھی ہیں۔ سرمایہ داری ایک فلسفۂ زندگی اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ ایک دین ہے جس نے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق پچھلے سو سال میں نہ صرف یورپی زندگی کو بلکہ پوری دنیا کو متاثر کیا۔

سب سے پہلے ہم اس نظام کی بنیادوں کا ایک سرسری سا جائزہ لیتے ہیں:

(۱) اس نظام کی خشتِ اول یہ ہے کہ افراد کو شخصی ملکیت کا غیر محدود حق حاصل ہے۔ اس میں لوگوں کو نہ صرف روزمرہ کے استعمال کی اشیاء رکھنے کی آزادی ہے بلکہ وہ اس امر میں بھی آزاد ہیں کہ آلات و وسائل کی پیدائش سے جس طرح چاہیں فائدہ اٹھائیں۔ وہ جو کام چاہیں کریں۔ جہاں اُن کا جی چاہے کارخانے لگائیں، جس چیز سے انہیں نفع کی توقع ہو پیدا کریں، اور جس قیمت پر اور جن طریقوں سے اپنا مال بیچنا چاہیں بیچیں۔ ان سارے معاملات میں اُن پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے۔ نفع کی صورت میں انہیں جو کچھ حاصل ہو وہ اُسے بلا شرکتِ غیرے اپنے مصرف میں لے آئیں۔ اسی طرح نقصان کا بوجھ بھی وہ تنہا برداشت کرنے پر آمادہ ہوں۔ سماج کو اس بات کا کوئی حق نہیں کہ وہ کسی کے کام میں مداخلت کرے۔ نظام سرمایہ داری یہ حقوق لوگوں کو اس لیے دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کسب و ہنر کے ملکات اپنی انتہائی وسعتوں کے ساتھ صرف اسی صورت میں رونما ہوتے ہیں جب ان کے لیے کوئی جذبہ یا کشش موجود ہو۔ یہ چیز انسان کی سرشت میں داخل ہے کہ وہ اپنی

محنت کے حاصل کا خود مالک اور مختار ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنی مساعی کی پیداوار کو "میری" کہنا چاہتا ہے۔ دراصل ملکیت کی خواہش ہی ایک ایسی آرزو ہے جس کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کی جاتی ہے۔

(۲) انسان کی اس خواہش کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اپنی ذات کے لیے کوشش کرے۔ اور اس سعی کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہو وہ اس کا مالک بنے۔ یہی ایک جذبہ انسانی کوششوں کا اصلی محرک ہے۔ اس کارگہ حیات میں جتنی رونق ہے وہ اسی کے دم قدم سے ہے۔ یہ جس قدر تگ و دو ہے سب ذاتی نفع کے حصول کے لیے ہے۔ نبضِ حیات میں تموج ہے تو اسی کی وجہ سے اور نظامِ عالم کے عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی دَوڑ رہا ہے تو اسی کی حرارت سے۔ ذہنِ انسانی سے اگر یہ جذبہ نکل جائے تو ہنگاموں اور شورشوں کی پُرشوکت دنیا راہبوں کی جھونپڑی اور سنیاسیوں کی کُٹیا بن جائے۔ لہٰذا انسانی ترقی کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ مادی نفع حاصل کرنے کے لیے امکانی حد تک جدوجہد کرے۔ اُس کی کوششوں کا اصل مقصود یہ ہونا چاہیے کہ وہ چھین جھپٹ کے لیے بھرپور ہاتھ مارے اور اپنی حاصل کی ہوئی دولت میں کم سے کم لوگوں کو شریک ہونے کا موقع دے۔ جب وہ آجر ہو تو اس کی نگاہیں کثیر تنخواہ پر مرتکز ہوں اور مستاجر ہونے کی شکل میں اُس کا گوہرِ مراد زیادہ سے زیادہ نفع کا حصول ہو۔

(۳)۔ اس نظام کا تیسرا اصول مسابقت ہے۔ یہ مسابقت نہ صرف مختلف طبقوں اور گروہوں کے درمیان پائی جاتی ہے بلکہ ایک ہی طبقہ اور ایک ہی گروہ کے مختلف افراد میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ جہد للبقاء (Struggle for Exiatance) کی کوکھ سے نکلی ہوئی اس ڈائن نے ایک ملک کو ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو تاخت و تاراج کیا ہے۔ مگر اس کے سحر کا کمال یہ ہے کہ لوگ تباہی کے عمیق غاروں کی طرف لڑھکتے ہوئے بھی یہی محسوس کر رہے ہیں کہ وہ ترقی کے بامِ بلند پر جا رہے ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ مسابقت نہ صرف بے قید معیشت میں اعتدال پیدا کرتی ہے بلکہ یہ کثیر پیداواری اور نمود پیداواری کا سب سے بڑا محرک بھی ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو لوگوں کو ایجاد و اختراع پر ابھارتا ہے۔ پروفیسر سلگ مین (Sel:.man) مسابقت کا ذکر

کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

"جس طرح حیاتیات میں مسابقت ترقی کی ضامن ہے، اسی طرح معاشی رقابت سے ہی سماج کی فلاح وابستہ ہے۔ اسی سے سرمایہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور جب یہ جذبہ ذاتی ملکیت کی رہنمائی میں اپنا عمل شروع کرتا ہے تو یہ ترقی کے لیے سب سے بڑا محرک ثابت ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ ہم اشیاء سے زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ یہ جذبہ سماج کا سب سے بڑا پاسبان اور محافظ ہے۔ یہ صارفین (Consumers) کو نفع اندوزوں کی دست بُرد سے بچاتا ہے۔ افراد کے اندر استعداد پیدا کرتا ہے۔ اور سماج اور فرد کے مفادات کو ہم رنگ اور ہم آہنگ بناتا ہے[1]"

(۴) اس نظام کا چوتھا اصول یہ ہے کہ اجیر اور مستاجر کے حقوق میں بنیادی فرق ہے اور اسے رکھ کر ہی ان کے باہمی مسائل کو طے کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پورا سماج دو ایسے طبقوں میں تقسیم ہو گیا ہے جن کی باہمی کشمکش سے ہی انسانیت ترقی کرتی ہے۔ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو ذرائع پیداوار کا مالک ہے اور دوسرا گروہ محنت کو فروخت کرنے والوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلا طبقہ اپنی ذمہ داری پر اوّل سے آخر تک اشیاء کی پیدائش کرتا ہے اور نفع کی صورت میں پوری دولت خود سمیٹتا ہے۔ اس کے برعکس جب نقصان ہو تو اس کا بوجھ بھی اُسے اکیلے ہی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مزدور پر کسی قسم کی آنچ نہیں آتی۔ یہی وہ اصل بنیاد ہے جس پر سرمایہ دار نہایت سنگدلانہ کارروائیوں کو مبنی بر انصاف سمجھتا ہے۔ اس بے انصافی کو جائز ثابت کرنے کے لیے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر کسی آفت کے وقت سرمایہ دار پورا نقصان خود برداشت کرتا ہے اور اس میں وہ کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا تو اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ اس سے نپٹنے کے لیے یا اس کو پورا کرنے کے لیے مزدوروں کا جس قدر خون چاہے نچوڑ لے۔

اس طرزِ فکر نے سماج کے ان دو طبقوں کے درمیان اختلاف کی ایک نہایت ہی گہری

[1] Principle of Economics (Book III)

خلیج حائل کر دی ہے اور یہ خلیج دن بدن وسیع ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت اور مودت کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ سرمایہ دار ہر وقت اس ٹوہ میں رہتا ہے کہ وہ مزدور سے جتنا زیادہ سے زیادہ کام لے وہی اس کے حق میں فائدہ مند ہے۔ اسی طرح مزدور کو بھی یہ فکر ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے کہ وہ پیدائش میں زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کرے۔ اس رقابت نے دشمنی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ دونوں گروہوں کے سینے نفرت کی مشتعل آگ سے پُر ہیں، جن سے سوائے خوفناک آوازوں اور جاں سوز انگاروں سے کچھ نہیں نکلتا۔ دشمنی کے اس آتش گیر مادے نے متعدد ملکوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے اور اب بھی دل گیتی کی دھڑکنیں مزید بربادی کی دہائی دے رہی ہیں۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار اس تباہی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کشمکش کو بالکل فطری سمجھتے ہیں اور اُن کا یقین ہے کہ یہ فطری کشمکش فطری قوانین کے تحت خود بخود کسر و انکسار سے گزر کر اجیر و مستاجر کے درمیان حقوق کا توازن قائم رکھے گی۔

(۵) اس نظام کا ایک اور اصول یہ ہے کہ معیشت کی فلاح و ترقی اور اس کے فطری نتائج کے ظہور کا دار و مدار ریاست کی عدمِ مداخلت پر ہے۔ ریاست کا کام صرف یہی ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے کہ انفرادی آزادیٔ عمل زیادہ سے زیادہ محفوظ ہو سکے۔ لوگ نہایت ہی امن و امان سے معاشی تگ و دو میں مصروف رہ سکیں اور ریاست اُن کے حقوقِ ملکیت اور معاہدات (Contracts) کی پوری طرح نگہداشت کرے۔

(۶) اس عہد کے نظامِ سرمایہ داری کی گاڑی جن پہیوں پر چل رہی ہے وہ سُود اور سٹہ (Speculation) ہیں۔ آج سے ایک صدی پیشتر سرمایہ لگانے والے اور صنعتی کاروبار انجام دینے والے اشخاص الگ الگ نہیں ہوتے تھے۔ اُس زمانہ میں سرمایہ دار اپنا کاروبار خود چلاتا۔ اُس کا پورا انتظام و انصرام اسی کے ہاتھ میں ہوتا۔ جب کبھی پیداوار میں کمی بیشی کرنا مقصود ہوتی تو اس کا فیصلہ بھی وہ خود ہی کرتا۔ مگر دورِ جدید میں بیش قیمت مشینوں کے استعمال نے ایک فرد کے لیے کسی کاروبار کا تن تنہا چلانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بنا دیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ

کاروبار کا تجربہ رکھتے ہیں اُن کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ کے لیے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کریں۔ ان حالات میں جبکہ دولت کا حاصل کرنا انسانی حیات کا اصل مقصد قرار پایا ہے کون بیوقوف ایسا ہوگا جو لوگوں کو دولت صرف اس لیے دے دے کہ وہ جا کر اس کو اپنے کاروبار میں لگائیں اُس سے مزید دولت حاصل کریں اور بعد میں اصل رقم اپنے اس "محسن" کو واپس دے دیں۔ آج کے سرمایہ دار کا مطالبہ یہ ہے کہ اُسے اُس کے سرمایہ کے استحصال کا ایک معقول "معاوضہ" ملنا چاہیے۔ چنانچہ اُس کے اس مطالبہ کی صحت پر یقین کرتے ہوئے سرمایہ دار کا حصہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ کاروبار خواہ فائدہ میں جارہا ہو یا نقصان میں سرمایہ دار کو اپنی محنت (جو اُس نے دولت کے جمع کرنے میں صرف کی ہے) کی "مزدوری" مل جاتی ہے۔ اس کو کاروبار میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور اُسے اس بات کا علم تک نہیں ہوتا کہ اُس کا دیا ہوا روپیہ کن کاموں پر صرف ہو رہا ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ اصول جن پر نظام سرمایہ داری قائم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارے اصول غلط نہیں۔ ان میں کسی حد تک صداقت بھی ہے۔ آغاز میں جب ان کو آزمایا گیا تو نہایت ہی خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ اشیاء کی پیدائش میں محیر العقول ترقی ہوئی۔ افراد خوش حال ہوتے۔ مگر کچھ وقت گزرنے کے بعد جب لوگوں کا خمار اترا اور اس نظام کی چوٹوں نے لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا تو پھر لوگوں کو اس کی تلخیوں کا احساس ہوا انہوں نے اپنی آنکھوں سے دولت میں اضافہ ہوتے دیکھا مگر ساتھ ہی اُن کے سامنے یہ حقیقت بھی آئی کہ یہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ رہی ہے۔ اگر انہوں نے ایک طرف عیش و آرام کی زندگی کے مختلف مناظر دیکھے تو دوسری طرف اُن کے سامنے خستہ حالی افلاس اور غربت کے بھی نہایت ہی گھناؤنے واقعات آئے۔ اس تفاوت نے انہیں چونکا دیا اور وہ اس بات کو سمجھ گئے کہ یہ نظام سراپا خیر نہیں بلکہ اس میں شر کے بھی بے شمار پہلو ایسے ہیں جن کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اب ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ اس نظام کی فکری لغزشوں کی نشان دہی کرتے ہیں:۔
اس نظام کا ایک سرسری سا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جاتی ہے کہ

اس میں خرابی کی اصل جڑ اس کا غلط فلسفۂ زندگی ہے۔ بے جان اشیاء کی کثیر پیداواری اور زود پیداواری نے انسان سے اس کی حقیقی قدر و قیمت چھین لی ہے۔ اب اگر اس کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے تو اسے بھی بے جان شے سمجھ کر طلب اور رسد کے قوانین کا پابند سمجھا جاتا ہے۔ عہدِ حاضر کے معیشت دانوں نے اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے کہ انسان صرف چند دھاتوں کا مرکب ہی نہیں بلکہ وہ زندگی کے جذبات و احساسات رکھتا ہے۔ فطرت نے اسے ایک خاص ذوق بخش رکھا ہے۔ اس میں اخلاقی حس بھی ودیعت کی گئی ہے۔ اس لیے اس کی پیدائش اور اس کے کام کو اشیاء کی پیداواری اور ان کے استحصال پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ مگر بدقسمتی سے دورِ حاضر کے فلاسفہ نے انسان کو بھی "کارخانہ کا تیار شدہ مال" سمجھ کر یہ "فتویٰ" صادر کر دیا ہے کہ اس کی "خرید و فروخت" میں بھی قیمت ہی وہ اصل ثالث ہے جو نہایت ہی انصاف کے ساتھ ہر مستحق کو اس کا اصل حق دلا دیتی ہے۔ یہ ہے وہ اصل خرابی جو اس نظام میں موجود ہے۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی اس حقیقت سے کسی قدر واقف ہے کہ کسی شے کی قیمت کا تعین رسد (Supply) اور طلب (Demand) کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اگر کسی چیز کی رسد کم اور طلب زیادہ ہو تو اس کی قیمت خود بخود بڑھ جائیگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نفع کے روشن امکانات کے پیش نظر لوگ ان اشیاء کو زیادہ مقدار میں پیدا کریں گے۔ اس طرح رسد کے بڑھنے کی وجہ سے قیمتیں خود بخود اعتدال پر آجائیں گی۔ مگر اسی اصول کو جب انسانوں پر نافذ کیا جائے تو یہ انسانیت پر ایک عظیم ظلم ہوگا۔ فرض کیجیے کہ ایک پیشہ ایسا ہے جس میں مزدوروں کی افراط ہے مگر ان کی طلب نہیں۔ ان حالات میں کیا یہ ممکن ہے کہ ہم انسانوں کی ایک بھاری تعداد کو جلد از جلد ایسے پیشوں کی طرف منتقل کریں جن میں ان کو آسانی سے کھپایا جا سکتا ہو۔ مزدوروں کی محنت کو ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بیچارے پیٹ کے بے رحم تقاضوں کے ہاتھوں اپنی محنت کو کم سے کم قیمت پر بیچنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ فاقہ مستی ان کو خود بخود کھینچ کر سرمایہ دار کے قدموں میں لا ڈالتی ہے۔ سرمایہ دار ان کی اس بے بسی اور بے کسی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کو کم سے کم اجرت پیش کرتا ہے اور ان بیچاروں کو حالات کی سنگینیں اسی پر

رضامند کر لیتی ہیں۔

جو لوگ قیمتوں کے نظام سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ تنہا ہر فریق کو اُس کے جائز حقوق دلوا سکتا ہے وہ اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ پیدائش کرنے والے مختلف عاملین (Factors of Production) ایک جیسی طاقت نہیں رکھتے۔ ان میں بعض زیادہ مضبوط ہیں اور بعض اُن کے مقابلہ میں بے حد کمزور۔ اگر چاروں عاملین (زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم) ایک جیسی قوت کے مالک ہوتے تو سماج میں ہر مستحق کو اپنا جائز حق مل جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ دورِ جدید کے معاشی نظام میں سب سے زیادہ طاقتور گروہ سرمایہ داروں اور منتظمین کا ہے۔ اس کے بعد زمین کے مالکوں کا طبقہ ہے اور سب سے کمزور اور لاچار مزدور ہیں۔ منڈی پر جب کبھی آفت آتی ہے تو اُس کی سب سے زیادہ زد محنت بیچنے والوں پر پڑتی ہے منتظمین (Enterpreneurs) جب یہ دیکھتے ہیں کہ قیمتیں گر رہی ہیں اور اُن کے منافع کم ہو رہے ہیں تو وہ سرمایہ کاری (Investment) میں کمی کر دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں کارخانے بند ہونا شروع ہوتے ہیں اور کاروبار ماند پڑ جاتا ہے۔ ملک کا امیر طبقہ اپنی پس انداز دولت کے ہوتے ہوئے اتنی سکت رکھتا ہے کہ نہایت ہی آرام سے مصیبت کے یہ دن گزار دے۔ اُسے اشیاء سستی ملتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ایک ایک پیسے کے بدلے کئی کئی پیسوں کا فائدہ حاصل کرتا ہے۔ پھر اُس کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے وہ "اتفاق کی برکتوں سے بھرپور متمتع" ہونے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ایک بندھی تجویز کے مطابق یہ لوگ نہایت ہی ہوشیاری سے اشیاء کی رسد کم کر کے منافع کو کم نہیں ہونے دیتے۔ اسی طرح سرمایہ دار بھی پیداوار میں "جزوِ اعظم" (Main Factor) کی حیثیت سے داخل ہونے کی وجہ سے اپنا "طے شدہ معاوضہ" حاصل کر لیتا ہے۔ اُسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ اُس کی اس پالیسی سے کتنے لوگوں پر مصیبت ٹوٹتی ہے۔ اُسے بہر حال اپنا حصّہ لینا ہے۔ کیونکہ یہ معاہدہ ہے اور اس کی پابندی کرانا نہ صرف لوگوں کا بلکہ حکومت کا اولین فرض ہے۔ زمین کے مالک بھی نسبتہً مضبوط پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر منافع میں سے کچھ نہ کچھ

حصہ ہتھیا لیتے ہیں۔ اب میدان میں باقی ایک طبقہ ایسا رہ جاتا ہے جس کو سب سے زیادہ کمزور اور بے سہارا ہونے کی وجہ سے نہایت ہی آسانی سے مصائب کی بھٹی میں جھونک دیا جاتا ہے۔ جسم و روح کے رشتہ کو برقرار رکھنے کے لیے اُسے روکھی سوکھی روٹی چاہیے۔ اسی طرح اپنا اور اپنے بال بچوں کا تن ڈھانکنے کے لیے اُسے کپڑے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ دو مطالبات اتنے شدید ہیں کہ ان کو روزگار کے مہیا ہونے تک اٹھایا نہیں جا سکتا۔ اس لیے جب کام ہوتا ہے تو یہ طبقہ تلاش روزگار میں در در کی خاک چھانتا ہے اور چیخ چیخ کر کہتا ہے "اے رزق کے مالکو! تمہارا جو جی چاہے ہمیں دو۔ مگر خدارا ہمیں موت کے مُنہ سے بچاؤ" سرمایہ دار اس کی مظلومیت اور بے سروسامانی کو دیکھ کر کساد بازاری کی ساری بربادیوں کو اُس کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اُس نے اپنے ظلم و استبداد کو روا رکھنے کے لیے حکومت سے یہ بات بحیثیت اصول کے منوا لی ہے کہ وہ لوگوں کے "کاروباری معاملات" میں کوئی دخل نہیں دے گی۔

پھر اس نظام کو چلانے والے وہ لوگ ہیں جو بالعموم سرمایہ داروں کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ مسندِ اقتدار پر آتے ہی اس لیے ہیں کہ اپنے حقوق کی ہر طرح سے حفاظت کر سکیں۔ اس لیے ان کے وجود سے ان کے اپنے گروہ کے آدمی تو عیش لوٹتے ہیں مگر دوسرے طبقے خصوصاً بندۂ مزدور کی زندگی نہایت تلخ ہو جاتی ہے۔

پچھلی ایک صدی کے واقعات نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ بغیر کسی اخلاقی ضابطہ کی پابندی کے سوسائٹی میں انصاف اور عدل قائم نہیں رہ سکتا۔ جب لوگوں کی زندگی کا منتہائے مقصود دنیوی فوائد و لذائذ سمیٹنا ہو تو پھر ان کی نظروں سے جائز و ناجائز کی تمیز بالکل اوجھل ہو جاتی ہے۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں رہتی کہ اُن کے آمدنی کے ذرائع کن کن طریقوں سے سماج میں ظلم و ستم، بے حیائی اور بد معاشی کو ترقی دے رہے ہیں۔ دولت کے پجاری کی حیثیت سے اُس کا نقطۂ نظر صرف یہی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اُسے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنی چاہیے، خواہ اُس سے اُس کی قوم اور ملت یا پوری انسانیت کو کتنا ہی نقصان پہنچے۔ اگر وہ یہ دیکھتا ہے کہ اُس کی آمدنی شراب

کی فروخت، رقص و سرود کی محفلیں سجانے اور فحش لٹریچر کی اشاعت اور اخلاق سوز تصویریں دکھانے سے بڑھتی ہے تو فوراً اپنا روپیہ ان کاموں میں کھپا دیتا ہے اور قطعاً محسوس نہیں کرتا کہ اس کی ان حرکات سے سماج کو بحیثیت مجموعی کس قدر خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے، کتنی عصمتیں لٹتی ہیں، کتنی عفتیں برباد ہوتی ہیں، کتنے نوجوان آوارگی کا شکار ہوتے ہیں اور کتنے افراد مجرم بنتے ہیں یہی نہیں بلکہ سرمایہ کاری کا رُخ فواحش کی طرف موڑ دینے سے ضروریات زندگی کم یاب بلکہ نایاب ہو جاتی ہیں۔ عوام گندم کے ایک ایک دانے کے لیے ترستے ہیں، انہیں موسمی ضروریات کے لیے تو کیا اپنا ستر تک چھپانے کے لیے کپڑا نہیں ملتا۔ اُن کے بچے دودھ کے ایک ایک قطرے کے لیے بلکتے ہیں اور اُس کے برعکس دوسری طرف سرمایہ داروں کی دولت پرستی اور نفع اندوزی کے طفیل انسانوں کا ایک قلیل طبقہ رفیع الشان محلات میں رہ کر اپنا سارا وقت عیش و تنعم میں بسر کرتا ہے۔ وہ دل جو خوفِ خدا سے خالی ہوں، جن کے اندر احساس جواب دہی ناپید ہو وہ اتنے بے حس ہوتے ہیں کہ لوگوں کے بڑے سے بڑے مصائب اُن کے اندر معمولی سے معمولی ارتعاش بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ اُن کی کیفیت یونان کے اُن فرضی خداؤں کی سی ہوتی ہے جو بلندیوں پر رہ کر صرف اپنے دھن دولت کے متعلق سوچ سکتے ہیں اور اپنے ذہن کو کبھی اس بات پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں پاتے کہ اُن کی ذات سے انسانیت کتنے دکھوں میں مبتلا ہے۔ ایسے لوگوں کی موجودگی میں کیا یہ ممکن ہے کہ صرف قیمت کا تقاضا سماج میں عدل و انصاف قائم رکھ سکے گا۔ جو لوگ اس طرز پر سوچنے کے عادی ہیں وہ جنت الحمقا میں بستے ہیں۔

جدید سرمایہ داری کی ایک اور لعنت بے روزگاری ہے۔ انسان نے جب بھاپ سے فائدہ اُٹھانا سیکھا تو پیداوار میں نہایت ہی سرعت کے ساتھ اضافہ ہوا۔ جو کام کئی سو انسان کئی دنوں میں کر سکتے تھے وہ اب ایک آدمی مشین کی مدد سے چند منٹوں میں کرنے لگا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سرمایہ دار ہمیشہ اس تلاش میں رہتا کہ وہ انسانوں کی تعداد گھٹا کر اُس کی بجائے مشینوں کے استعمال کو بڑھا دے، کیونکہ اس سے نفع میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ افراد کی جگہ مشینوں نے لینا شروع کی جب

ملک کے پورے طول و عرض میں اسی پالیسی پر عمل ہونا شروع ہوا تو ہزاروں نہیں لاکھوں انسان بیروزگار ہو گئے۔ وہ کام حاصل کرنے کے لیے جس کارخانے کی طرف بھی رجوع کرتے کلوں کی گڑگڑاہٹ انہیں یہ بتا دیتی کہ بھاپ کے دیو کی خدمت گزاری نے اب انسانی محنت کی ضرورت باقی نہیں رہنے دی۔ لہٰذا اب اس آسمان کے نیچے اُن کے لیے کوئی کام نہیں، اس لیے انہیں دنیا سے جلد از جلد کوچ کرنے کی فکر کرنا چاہیے۔ ایشیائی ممالک میں اس مسئلہ نے جو صورت پیدا کر دی ہے اگر ہم اُس کو فی الحال نظر انداز بھی کر دیں تو یورپ کے صنعتی ممالک میں بے روزگاری کا جو حال ہے اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ	۲۶۹۰۰۰ افراد
اٹلی	۳۰۹,۰۰۰ "
آسٹریا	۲۲۵,۰۰۰ "
پولینڈ	۱۷۰,۰۰۰ "
برطانیہ	۱۲,۰۴ر۰۰۰ "
جرمنی	۲۴۸۴ر۰۰۰ "

اس بیروزگاری نے سماج میں بے شمار کاروباری پیچیدگیاں ہی پیدا نہیں کیں بلکہ اس نے اَن گنت اخلاقی اور ذہنی بیماریوں کو بھی جنم دیا ہے۔

اس عہد میں جن خوش نصیبوں کو روزگار ملتا بھی ہے وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔ اپنی درماندگی کی وجہ سے مزدور اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنے جائز حقوق حاصل کر سکیں۔ اُن پر جس قدر رکرم فرمائی کی جاتی ہے وہ اُن کا دو وقت کا پیٹ بھرنے کے لیے بھی ناکافی ہوتی ہے۔ دوسری طرف سرمایہ دار ہر آن اشیاء کی پیدائش میں مصروف رہتا ہے اور پھر ان کے نکاس کی تدبیریں بھی سوچتا ہے مگر لوگوں کی اکثریت بے روزگار یا نیم بے روزگار ہونے کی وجہ سے اپنے اندر یہ طاقت نہیں رکھتی کہ کارخانے کے تیار شدہ مال کو خریدے۔ سرمایہ دار اپنے مال کی کھپت کے لیے سب سے پہلے انہیں

بے بس عوام کی طرف دیکھتا ہے جنہیں اُس نے دھکے دے کر نہایت ہی کس مپرسی کی حالت میں اپنے کارخانے سے نکال دیا تھا۔ سرمایہ داری نظام میں یہ ایک ایسا تضاد ہے جس کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ مزدور جب روزگار مانگتا ہے تو وہ سرمایہ دار کا دشمن ہے۔ اُسے اس "مٹی" کی مشین کے مقابلہ میں لوہے کی "مشین" زیادہ عزیز ہے۔ مگر جب اسے اس مشین کے تیار شدہ مال کو فروخت کرنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو وہ پھر مجبوراً اپنے آپ کو اسی طبقہ کا محتاج پاتا ہے۔ مختلف حیلوں اور بہانوں سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ لوگ کسی نہ کسی طرح اس کے مال کو خریدیں۔ سرمایہ داری نظام میں یہ ایک ایسا سقم ہے جس کو دور کرنے کے لیے انسان کو اشتراکیت اور فسطائیت ایسی خوفناک راہیں تلاش کرنا پڑیں۔ مشہور مصنف ایرک گل (Eric Gill) اسی چیز کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :-

"ہمیں کارخانوں میں انسانوں کی ضرورت نہیں، مشینیں ان سے بہتر ہیں۔ ان کی ایجاد اور استعمال کا سب سے بڑا مقصد انسانی محنت کی بچت ہے۔ لہٰذا ہمیں مشین کو نہیں انسانوں کو ختم کرنا ہے مگر وہ انسان جسے ہم دنیا سے مٹا دینے کے آرزومند ہیں وہ وہ انسان ہے جو کارخانہ میں کام کرتا ہے۔ نہ کہ گلی میں بسنے والا انسان۔ محلوں میں رہنے والے انسان ہمارے ساتھی ہیں، وہ ہمارے دوست ہیں۔ کیونکہ وہ ہمارا مال خریدتے ہیں۔ آج کل سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح پیدائش میں انسانی محنت کے دخل کو ختم بھی کیا جائے اور دوسری طرف صارفین (Consumers) کی تعداد اور اُن کی قوتِ خرید کو بھی بڑھایا جائے۔ یہی ہمارا بنیادی مسئلہ ہے؛ جڑ بھی یہی ہے اور شاخ بھی یہی ہے۔"[1]

عہدِ حاضر کی استعماریت (Imperialism) اسی طرزِ فکر کا شاخسانہ ہے۔ جب کسی ملک کا سرمایہ دار طبقہ یہ دیکھتا ہے کہ اُس کی اپنی غلط روش اور ناعاقبت اندیشانہ بلکہ ظالمانہ طرزِ عمل سے اُس کی اپنی قوم کے افراد اس قدر غریب اور مفلس ہو گئے ہیں کہ ان میں اس کے تیار کردہ

---

[1] Eric Gill "Money and morals"

مال کو حاصل کرنے کی ہمت نہیں رہی تو وہ پھر ملک سے باہر منڈیوں کی تلاش کرتا ہے۔ چنانچہ اس عہد کا مغربی استعمار محض ایک قسم کی منظم تجارت اور مسلسل و مستقل مادی انتفاع ہے جس کی کوئی بلند اخلاقی یا دینی غرض اور کوئی اصلاحی و تہذیبی اور شریفانہ مقصد نہیں۔ سر ولیم جانسن ہاک نے جو ۱۹۲۵ء میں برطانوی وزارت کے رکن تھے۔ پارلیمنٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف کیا:

"ہم نے ہندوستان اس لیے فتح نہیں کیا کہ ہم ہندوستانیوں کو نفع پہنچاتے رہیں گے۔ مجھے علم ہے کہ ہمارے مسیحی مشنری اپنے جلسوں میں کہا کرتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان اس لیے فتح کیا کہ ہندوستانیوں کے مرتبہ میں ترقی ہو یہ دعویٰ محض دھوکا ہے۔ ہم نے ہندوستان اس لیے فتح کیا ہے کہ برطانیہ کے مال و اسباب کے فروخت کے لیے ایک منڈی ہاتھ آئے ..... میں منافق نہیں جو یہ کہنے لگ جاؤں کہ ہم ہندوستانیوں کے نفع کے لیے ہندوستان پر قبضہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہندوستان پر ہمارا قبضہ انگریزی تجارت خصوصاً لنکا شائر کے سوتی کپڑے کی منڈی کی حیثیت سے ہے[1]۔"

اسی طرح سر رجنالڈ کریڈک، سر مائیکل اوڈائر، لارڈ لڈہم، جنرل سر کلاڈ جیکب، اور مشہور مورخ سر چارلس اومین کی ایک متحدہ تاریخ کا اقتباس حسب ذیل ہے:۔

"ہندوستان ہماری مصنوعات کا دنیا میں سب سے بڑا گاہک ہے، برطانیہ جیسی کوئی تجارتی قوم ایسے گاہک کو بغیر اپنے آپ کو نقصان عظیم پہنچائے ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتی اور یہ نقصان برداشت کرنے والے کون ہیں، ہمارے بینک، ہماری جہازی کمپنیاں، ہماری صنعتیں، ہمارے تنخواہ دار ملازمین اور ہمارے مزدوری پیشہ طبقے[2]۔"

ان منڈیوں کی ضرورت صرف ایک قوم کو ہی نہیں بلکہ ساری مغربی اقوام کو ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنے لیے وسیع سے وسیع تر منڈی تلاش کرے جہاں اس کے مال کی کھپت ہو سکے۔ اس ایک شکار کی تلاش میں جب بہت سے شکاری نکلیں تو ان کے اندر باہمی

[1] بحوالہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا؟" از مولانا ابوالحسن علی ندوی
[2] بحوالہ: ایضاً

رقابت کا پیدا ہو جانا بالکل ایک قدرتی سی بات ہے۔ چنانچہ عہد حاضر کی ساری جنگیں اسی خود غرضی کا نتیجہ ہیں۔ دور حاضر کا ایک مبصر اسی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"یہ جنگ تو محض حریف جماعتوں کی ایسی کشمکش ہے جن میں سے ایک دنیا کی دولت اور آمدنی کے وسائل کے بڑے حصہ پر قابض رہنا چاہتی ہے اور دوسری اس کے حصہ کے لیے اپنی جان کی بازی لگاتی ہے"

یہ عالمگیر لڑائیاں جنہوں نے اس صدی میں پوری دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے نظام سرمایہ داری کا ضروری حصہ ہیں۔ استعماری ممالک جب ہوا کے رخ کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے مال کی نکاسی مشکل ہو گئی ہے تو وہ پھر ایک سوچی سمجھی تجویز کے مطابق اس قسم کی چالیں چلنا شروع کرتے ہیں جس سے جنگ کے خطرات بڑھ جائیں۔ اس وجہ سے ان کے مال کی طلب کچھ دیر کے لیے بڑھ جاتی ہے اور بیروزگاری وقتی طور پر ان کے اپنے ملک سے غائب ہو جاتی ہے۔

منڈیوں پر قبضہ صرف قوت کے بل پر ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے لیے بعض اوقات ایسے حیلے اور بہانے اختیار کیے جاتے ہیں کہ ان کے تصور سے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ ان میں ایک طریقہ مصنوعی ارزانی (Demping) ہے۔ اس میں صرف منڈی پر تسلط قائم کرنے کے لیے وہاں کثیر تعداد میں اشیاء نہایت ہی ارزاں بیچ دی جاتی ہیں۔ اور جب مخالفین اس ارزانی کی تاب نہ لا کر مقابلہ اور مسابقت کو ترک کر دیتے ہیں تو اس کے بعد اشیاء درآمد کرنے والوں کا یہ گروہ نہایت ہی آسانی سے اپنی من مانی کارروائیاں کرتا ہے۔ اس طریقہ سے سب سے زیادہ نقصان جس طبقہ کو پہنچتا ہے وہ مزدور ہے۔

یہی نہیں بلکہ دنیا کے دولتمند طبقے اپنے منافع کو ہر قسم کی دست برد سے بچانے کے لیے اکثر اوقات نہایت ہی ناپاک ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ اس کے لیے گندم کی کھڑی فصلیں جلا دی جاتی ہیں تاکہ اناج کی رسد بڑھ کر ان کے منافع میں کمی نہ کر دے۔ مشہور مصنف جان گنتھر (Thon Gunthur) انہی اخلاق سوز حرکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"۱۹۱۴ء میں برازیل کے اربابِ ثروت کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ پیدا شدہ کافی (Coffee) کو کس طرح کم کیا جائے۔ پہلے انہوں نے اس کو دفن کرنے کا عزم کیا۔ مگر اب مصیبت یہ آئی کہ ۲۰ لاکھ بوریوں کو دبانے کے لیے بھی کافی رقبہ درکار تھا۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ انہیں سمندر میں پھینک دیا جائے مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ کیونکہ اس سے بیشمار مچھلیوں کے تباہ ہونے کا خطرہ تھا۔ بالآخر بہت زیادہ سوچ بچار کے بعد یہ طے ہوا کہ اس کو جلا دیا جائے۔ چونکہ اس پودے میں پانی کی کافی مقدار موجود ہوتی ہے اس لیے اس کو جلانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ آخر کار مٹی کے تیل سے اس کو جلایا گیا۔ اس طرح برازیل کو ہر سال اس زائد پیداوار سے نجات حاصل کرنے کے لیے تقریباً ۲ لاکھ پونڈ کی مالیت کا تیل صرف کرنا پڑا[1]۔"

اسی طرح ایک دوسرا مصنف سرمایہ دار طبقہ کی اسی بے حسی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

"۱۹۳۲ء میں لورپول کی بندرگاہ سے دس لاکھ نگتروں کو سمندر کی موجوں کی نذر کر دیا گیا تاکہ رسد بڑھنے نہ پائے اور اس طرح قیمتوں میں کوئی کمی واقع نہ ہو۔ . . . یہی وہ نگترے تھے جن کے لیے لورپول کے بچے ترستے تھے اور ان کے لیے یہ ایک جنس نایاب تھی[2]۔"

وہ شخص جس نے موجودہ عہد کی تحریکات کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ اس نظام سرمایہ داری کی اساس الحاد ہے۔ چنانچہ اس نئے "دین" کے ساتھ جو نیا فلسفۂ اخلاق دنیا میں مقبول ہوا اس کے لیے اگر کوئی لفظ موزوں ہو سکتا ہے تو وہ صرف "مفاد پرستی" ہے۔ اس کے مطابق ہر وہ طریقہ جائز اور صحیح ہے جس سے کوئی "دنیاوی فائدہ" حاصل ہونے کی توقع ہو اور وہ کام غلط ہے جس کے کرنے سے اس میں کمی واقع ہوتی ہو۔ اس لیے اس نظام میں اخلاقی پیمانے ہر لمحے اور ہر آن ایک ایک فرد کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں یہی وہ اصل وجہ ہے کہ وہی بوجود

---

[1] Inside Latin America

[2] Hindranath Mukerjee : An Introduction to Socialism p. 16

حضرات جو وسیع المشربی اور جمہوریت کے سب سے زبردست داعی تھے اور جنہوں نے بہت زیادہ جدوجہد کے بعد مالکان زمین کے مقابلہ میں اپنے ووٹ کا حق تسلیم کرایا تھا۔ اس بات کے لیے تیار نہ ہوتے تھے کہ اس ووٹ کا حق وہ اُن لاکھوں کروڑوں انسانوں کو بھی دے دیں جن کے رزق پر اُن کا قبضہ ہے۔ وہ اپنے لیے تو یہ حق سمجھتے تھے کہ اپنی انجمنیں بنا کر اپنے ہاتھوں کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کریں اور اس طرح اپنے مخالف طبقوں کے مقابلہ میں نہایت ہی قوت کے ساتھ صف آرا ہو سکیں مگر جب یہی حق مزدور طلب کرتے تو ان کی پیشانیوں پر تیور آجاتے اور ان کے غیظ و غضب کا طوفان کسی طرح تھمنے نہ پاتا۔

چنانچہ مزدوروں کو اپنے اتحادیے (Unions) بنانے کا حق بہت سی کوششوں کے بعد حاصل ہوا۔ جن لوگوں نے مزدوروں کی ان انجمنوں کو کام کرتے دیکھا ہے وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کی راہ میں سرمایہ دار کس طرح رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ محنت کش عوام کی مفلسی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ کس طرح انہی کے اپنے طبقہ میں سے بعض ایسے منافق تلاش کر لیتا ہے جو اس کے آلۂ کار کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور مزدوروں کی یک جہتی اور اتحاد کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔ ملک کا سرمایہ دار روپیہ کی مدد سے غربا کے ووٹ خرید کر حکومتوں کے ایوانوں تک پہنچتا ہے اور وہاں رسائی حاصل کر لینے کے بعد وہ حکومت کی مدد سے ان مزدوروں کو ہر قسم کی تحریکات کو قوت سے دبا دیتا ہے یہ بچارے جب کبھی اپنی مظلومیت کا احساس کرتے ہوئے سر اٹھاتے ہیں تو حکمراں طبقہ کی توپوں کے دہانے اُن پر کھول دیے جاتے ہیں۔ پروپیگنڈا کی پوری مشینری کو اُن کے خلاف حرکت میں لا کر انہیں اس طرح بدنام کر دیا جاتا ہے کہ وہ پھر جیتے جی بولنے کی جرأت نہیں کرتے۔

اس عہد میں دولت و سیاست جس طرح ایک دوسرے کے ہم رکاب ہیں اس کا اندازہ پچھلے چند سال کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ جوزف اے۔ لیگٹن (Joseph A. Leighton) نے اپنی کتاب Social Philosophies in Conflict. میں اس کی متعدد مثالیں دی ہیں جن میں سے یہاں چند نقل کی جاتی ہیں۔ ان سے صورت حالات کا ایک سرسری سا اندازہ ہو سکے گا۔

۱۹۳۵ء میں ریئبرن بل (Rayburn Bill) پر ملک میں ایک ہنگامہ

بپا ہوا۔ سینیٹ کے ممبروں اور پارلیمنٹ کے ارکان کے گھروں میں بے شمار تاریں بھیجی گئیں۔ صرف ایک شہر کی تاروں کی تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ پندرہ ہزار میں سے صرف تین اشخاص نے پیسے ادا کیے۔ افراد کو اپنے دستخط دینے کے لیے معاوضہ دیا جاتا اور افراد کے نام ڈائرکٹری (Directory) میں سے حاصل کیے جاتے۔ اکتیس ہزار تاروں میں سے جو ۲۵ شہروں سے دی گئیں، ان میں سے ۱۴ افراد وہ تھے جنہوں نے ان کی قیمت خود ادا کی۔ باقی سارے اخراجات گیس اور بجلی کی کمپنی نے برداشت کیے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس بل کو ناکام بنانے کے لیے کمپنی کو آٹھ اور نو لاکھ کے درمیان رقم خرچ کرنا پڑی۔ اس نے بعض اخبارات کو یہ دھمکی دے کر تنقید سے روک دیا کہ اگر وہ اس بل کی حمایت کریں گے تو انہیں تنہا بات دینا بند کر دیے جائیں گے"۔[1]

آپ خود اندازہ لگائیں کہ کیا ملک کا مزدور اپنی کسی بات کو حکومت سے منوانے کے لیے اس سے نصف رقم بھی صرف کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امراء حکومت کے سیاہ و سپید کے مالک ہوتے ہیں اور وہ قوانین کو جس طرح چاہتے ہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ مزدور بیچارہ بالکل ان کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندر اتنی ہمت بھی نہیں رکھتا کہ یہ بھی کہہ سکے کہ حضور میرے بیمار پڑنے پر مجھے بھی با تنخواہ رخصت دی جائے۔ اور بڑھاپے کی حالت میں جب کہ بندہ نے اپنی صحت طاقت اور جوانی سب کچھ جناب کے قدموں میں قربان کر دیا ہے مجھے اتنا تو دے دیا جائے جس سے زندگی کی ٹمٹماتی لو کچھ دیر قائم رہ سکے۔ دنیا کا سرمایہ دار طبقہ جو آزادی کا نعرہ لگاتا ہوا، اور ذاتی مفاد کی برکات کا ذکر کرتا ہوا کبھی نہیں تھکتا جب اس مقام پر آتا ہے کہ یہی حق وہ دوسروں کو بھی دے تو یہاں وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس کی نگاہیں بدل جاتی ہیں۔ اس کے اخلاقی معیار تبدیل ہو جاتے ہیں۔

سرمایہ داری نظام کے سامنے ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو تجارتی چکر (Trade Cycle)

[1] Joseph A. Leighton : Social Philosophies in Conflict p. 336

کے شر سے کس طرح بچائے۔ ۱۹۳۵ء کی سرد بازاری کے بعد اس سوال نے بہت زیادہ اہمیت حاصل کرلی ہے۔ اب دنیا کے سارے ممالک اس مصیبت کا تدارک سوچ رہے ہیں۔ مگر وہ اپنی ساری کوششوں کے باوجود اس کا کوئی خاطر خواہ حل تلاش نہیں کرسکے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی طریقہ کارگر ہوسکتا ہے تو وہ یہی کہ حکومت عدمِ مداخلت کی پالیسی کو خیرباد کہہ کر ملک کی معاشی تنظیم ایک منصوبہ بندی کے تحت کرے اور اس طرح پیداوار کے سارے ذرائع وہ اپنی تحویل میں لے لے۔

جن لوگوں نے سرمایہ داری نظام کے اس روگ کا ذرا گہری نظر سے تجزیہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اس کے اصل اسباب معاشی نہیں بلکہ غیر معاشی ہیں۔ جب ملک کا سرمایہ دار یہ دیکھتا ہے کہ مزید سرمایہ کاری سے اُس کا منافع بڑھے گا تو وہ پھر اپنے سرمایہ کو بے دریغ مختلف صنعتوں میں لگاتا ہے۔ اس سے کام بڑھتا ہے۔ مزدوروں کو مزدوری ملتی ہے اور اس طرح اُن کی قوتِ خرید بڑھنے سے اُن کی طلب[1] میں کسی قدر اضافہ ہوجاتا ہے۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے لوگ نئے نئے کام شروع کرتے ہیں۔ وہ بغیر سوچے سمجھے سود پر روپیہ دیتے چلے جاتے ہیں۔ سرمایہ دار کو جب اپنے روپے کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنی شرح بڑھا دیتا ہے۔ جب یہ طبقہ پیدائش میں سے زیادہ حصہ لینے کی کوشش کرتا ہے تو منتظمین کا نفع کم ہوجاتا ہے۔ دوسری طرف گرم بازاری کے اس دَور میں مزدور کو اگرچہ کام ملتا ہے، اس کی اُجرت بڑھتی ہے مگر وہ اس رفتار سے نہیں بڑھتی جس رفتار سے کہ اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی قوتِ خرید گر جاتی ہے۔ اس لیے بعض اشیاء کی طلب قدرتی طور پر گھٹ جاتی ہے۔ مگر اس معاشی تنظیم میں یہ ناممکن ہے کہ سرمایہ دار اپنے سرمایہ کو جلد از جلد دوسری طرف منتقل کردے۔

علاوہ ازیں جس طرح، اہلِ صنعت کی مانگ میں اضافہ ہونے کا احساس پیدا کرنے کے لیے کچھ عرصہ درکار ہے، اسی طرح مانگ میں کمی واقع ہونے کی صورت میں بھی اُنہیں کچھ عرصہ کے بعد اس کا احساس ہوتا ہے کہ اب بازار سرد پڑنے لگا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادھر تو اس شئے

---

[1] Lord Keynes لارڈ کینز اس کے لیے مؤثر طلب (Effective demand) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

کی مانگ گھٹتی چلی جاتی ہے اور ادھر اس کی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ پھر جب کچھ عرصہ کے بعد اہل صنعت بازار کی نبضوں پر ہاتھ رکھ کر یہ محسوس بھی کر لیتے ہیں کہ اب اس کی رفتار بہت سست ہے تب بھی ان کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں وہ شئے مطلوبہ کی جو مقدار تیار کر چکے ہیں اس کی نکاسی کے لیے کیا تدابیر اختیار کریں۔ یہ مصیبت صرف ایک کارخانہ دار پر نازل نہیں ہوتی بلکہ سب پر ٹوٹتی ہے۔ حتیٰ کہ پورے سماج کے لیے یہ امر دشوار بن جاتا ہے کہ اشیائے مطلوبہ کی ایک کثیر اور وافر مقدار کو بازار میں کس طرح فروخت کیا جائے۔ منافع کے امکانات ذرا تاریک ہونے کے ساتھ ہی سرمایہ دار پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اس قسم کی حرکات کرنے لگتا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ذہن پر ایک زبردست خوف طاری ہے۔ وہ ایک طرف مال کی پیداوار کم کر دیتا ہے اور دوسری طرف مال کی نکاسی کی فکر کرتا ہے۔ اس کی ان حرکات سے اشیاء کی قیمتیں گر جاتی ہیں۔ جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو بڑی تعداد میں کارخانے بند ہونے لگتے ہیں۔ مزدوروں کی ایک بڑی اکثریت بیکار ہو جاتی ہے اور منڈیوں کی گرم بازاری اچانک سرد بازاری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ آفت جو سرمایہ دار ممالک پر آٹھویں دسویں سال نازل ہوتی ہے اس نظام کی سب سے بڑی کمزوری ہے جسے دور کرنے کا کوئی طریقہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔

اگر آپ اس کو ذرا غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سب کچھ "دولت پرستی" کا کرشمہ ہے۔ اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ "ذاتی مفاد" ہماری زندگی کا رہنما اصول بن گیا ہے۔ اس لیے جب اہل ثروت یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے منافع کم ہو گئے ہیں تو وہ بڑے ہی مضطرب ہو جاتے ہیں۔ اور سرمایہ کاری سے اس طرح ہاتھ کھینچتے ہیں کہ پورا ملک تباہی کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اگر لوگوں پر روپیہ کی محبت غالب نہ ہو تو وہ معاشی تنظیم کرتے وقت یہ سوچ لیں کہ اُن کی کسی پالیسی سے کتنے غریب تباہ ہوں گے۔ مگر سرمایہ دار کے دل میں انسانیت کی محبت سے زیادہ منافع کی محبت ہے اور اسی وجہ سے سوسائٹی بار بار تجارتی چکر کے گرداب میں پھنستی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کو جو چیز غذا بہم پہنچا رہی ہے وہ "سود" ہے۔ اس میں افراد کو یہ پورا حق دیا

گیا ہے کہ وہ اپنے گاڑھے پسینے سے کمائی ہوئی دولت کو جمع کریں اور پھر اسے سُود پر چلائیں۔ سُود ایک قابلِ نفرت برائی کی حیثیت سے تو پہلے بھی سوسائٹی میں چلا آتا تھا مگر جدید نظام کا کمال یہ ہے کہ اُس نے اس بُرائی کو عین بھلائی میں، اور اس ظلم کو عین خدمت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس وجہ سے اب معاشی نظام اس طرز پر ڈھالا گیا ہے کہ سوسائٹی بجائے پوری انسانیت کی پاسبان اور محافظ بننے کے صرف سود خواروں اور اس کے ساتھیوں کی پشت پناہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس وجہ سے سماج میں ایک ایسے طاقتور طبقے نے جنم لیا جو عوام سے ہر طرح کا فائدہ تو اٹھاتا ہے مگر اُن کی مصیبتوں میں کسی طرح بھی شریک نہیں ہوتا۔ اُسے اگر کوئی غرض ہے تو اپنے "معین معاوضہ" سے۔ وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ کاروبار ترقی کر رہا ہے تو پھر بے دریغ ہو کر اپنا روپیہ لگاتا ہے۔ اس طرح سود کی شرح بڑھتی ہے اور پھر نفع کے امکانات مخدوش ہو جاتے ہیں۔ اُس کی اپنی ہی "کرم فرمائیوں" سے جب کاروبار سرد پڑنے لگتا ہے تو پھر یہ عالم بجائے سماج کی امداد کرنے کے ان پُر آشوب حالات میں اپنا لگا ہوا سرمایہ واپس لینا شروع کر دیتا ہے۔ سرمایہ کاری میں کمی ہو جانے کی وجہ سے سوسائٹی میں کام کا دائرہ اور بھی سکڑتا ہے یہاں تک کہ ساری دنیا پر سخت کساد بازاری کی آفت آپڑتی ہے مگر ان حالات میں بھی نقصان، زحمت، خطرے سب دوسروں کے لیے ہیں اور وہ ان آفتوں سے بالکل محفوظ ہوتا ہے۔ مشہور مفکر لارڈ کینز (Lord Keynes) نظام سرمایہ داری کی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے سود کو اس کا سب سے بڑا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اُس کا تجزیہ یہ ہے کہ سُود کے بڑھنے سے منافع کے امکانات گھٹ جاتے ہیں اور جب سوسائٹی پر یہ کیفیت طاری ہو جائے تو کاروبار سرد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"یہ بحران اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ شرح سُود معاشی مشین کے پہیئوں کو بریک لگا دیتی ہے"

سرمایہ دار طبقہ کا یہ سنگدلانہ اور ظالمانہ رویہ صرف افراد ہی سے نہیں ہوتا بلکہ قوم و ملت کے ساتھ بھی وہ یہی سلوک روا رکھتا ہے۔ وہ اگر قوم اور ملک کو بھی اپنا روپیہ مستعار دیتا ہے تو اس

شرط پر کہ اُسے بہر حال اپنا "منافع" ملنا چاہیے۔ حد یہ ہے کہ اگر ان پر کوئی آفت بھی آئے اور افراد کو اپنی جانوں تک کی قربانی دینی پڑے تو ان حالات میں بھی اس ذلیل طبقے کا مطالبہ بہر حال اپنی جگہ اٹل رہتا ہے کہ ان کے سرمائے پر اتنے فی صدی سود سالہا سال تک ضرور ادا ہوتے رہنا چاہیے۔ سود کے اصول پر منافع کے یک طرفہ بہاؤ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پوری دنیا کا معاشی توازن ہی بگڑ گیا ہے۔

یہ ہیں وہ مفاسد جو اس نظام کے تن بدن سے پیپ بن کر نکل رہے ہیں۔ ان مفاسد کو خود سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے کارپرداز محسوس بھی کرتے ہیں، اور اصلاح حال کی تدابیر بھی سوچتے ہیں۔ کہیں مزدوروں کی اُجرتوں میں اضافہ کیا جاتا ہے، کہیں انہیں منافع میں شریک کرنے کی فکر کی جاتی ہے۔ کہیں انہیں علاج کی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ مگر جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالکل ناکافی ہے۔ کارلائل (Carlyle) نے جو بات کئی سال پیشتر کہی تھی وہ آج بھی اسی طرح سچ ہے۔ ترقی کے اس زمانہ میں بھی اگر ایک طبقہ اس وجہ سے چیخ رہا ہے کہ اُس کی ۲۰ لاکھ قمیصیں بیکار پڑی ہیں اور اُن کا کوئی گاہک نہیں ملتا تو دوسری طرف بیس لاکھ انسان اس لیے چلا رہے ہیں کہ اُن کے پاس تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا نہیں۔ ان ساری تدابیر میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ اگر آپ پچھلے پچاس سال کے حالات کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیں تو معلوم ہوگا کہ معاشی انتقاد کے لیے جس "دستِ غیب" (Invisible hand) کا سہارا لیا گیا تھا وہ بالکل فضول ثابت ہوا ہے۔ سرمایہ داری کے اندھے معتقدین جو چاہیں کہتے رہیں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ یہ نظام انسانیت کی فلاح کے نقطۂ نظر سے سخت ناکام رہا ہے۔ اس میں سے جو مفاسد اُبھر کر سامنے آئے ہیں اُن کی روک تھام کی ساری کوششیں بالکل عبث اور بیکار ثابت ہو رہی ہیں۔ اور اُن کا حاصل صرف یہی ہے۔ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی![1]

---

[1] جو اصحاب سرمایہ دارانہ نظام کے جمہوری پہلو پر مزید مطالعہ فرمانا چاہیں وہ مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔
(بقیہ بر صفحہ ۱۴۴)

تعارف کتب

(عبد الحمید)

اللہ کی بادشاہت | مؤلفہ: پرنس سعید حلیم پاشا صفحات ۱۶۸۔ ناشر: مکتبہ تعمیر انسانیت گیر گلی، لاہور۔

کتاب کا مصنف ان یگانۂ روزگار ہستیوں میں سے ہے جنہیں قسام ازل نے تجدید و اصلاح دین کے لیے منتخب فرمایا۔ مرحوم ایک طرف یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باعث ان تمام کمالات کے جامع تھے جو مغربی تعلیم کا سرمایۂ افتخار سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف ایک صحیح الخیال اور راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم معقول و منقول میں خاصی دسترس رکھتے تھے۔ اس لیے ان کا نقطۂ نظر قریب قریب مومنانہ ہے۔ اس کے علاوہ مرحوم ایک عظیم ریاست کے وزیر اعظم رہے ہیں اس لحاظ سے ان کے خیالات اپنے اندر تجربے اور کارکردگی کا وزن بھی رکھتے ہیں۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب ٹرکی کے بعد ترکوں میں بھی اسی طرح اختلاف رائے پیدا ہو گیا جس طرح آج پاکستان میں ہے۔ ایک جماعت جدید الخیال لوگوں کی طرح ٹرکی کو مغرب کے نقش قدم پر کورانہ لے جانا چاہتی تھی مگر دوسری جماعت اس کو دین حق کا پابند دیکھنے کی متمنی تھی۔ پرنس سعید حلیم پاشا موخر الذکر جماعت کے گل سرسبد تھے۔ مضمون زیر بحث مرحوم کی انہی کوششوں کی ایک کڑی ہے۔

اصل مضمون فرانسیسی زبان میں لکھا گیا تھا۔ فرانسیسی زبان سے اسے جناب محمد مارمیڈیوک پکتھال رحمتہ اللہ علیہ سابق مدیر بمبئی کرانیکل و رکن محکمۂ تعلیمات حیدر آباد دکن اور مترجم قرآن حکیم نے اسے انگریزی کا جامہ پہنایا، اور انگریزی سے مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے اسے اُردو میں منتقل کیا۔ مولانا محمد علی ایم۔ اے (کینٹب) نے ایک فاضلانہ مقدمہ اور جگہ جگہ وضاحتی نوٹس لکھ کر اس کی افادیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے

فاضل مصنّف سب سے پہلے اہلِ مغرب اور بعض مغرب زدہ مسلمانوں کی اس غلط فہمی کو دُور کرتے ہیں کہ اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح خدا اور انسان کے درمیان ایک پرائیویٹ رشتہ ہے۔ اس لیے اگر ہم اسلام کا احیاء چاہتے ہیں تو ہمیں پورے نظامِ زندگی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اسے خالص اسلامی بنیادوں پر استوار کرنا ہو گا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

"مسلمانوں کی بیداری سے جو مسرت مجھے حاصل ہوتی ہے وہ افسوس سے بدل جاتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اکثر سرکردہ لیڈر اپنے ملکوں میں اسی نظام کے رائج کرنے پر تُلے ہوئے ہیں جو اہلِ مغرب کی بھونڈی نقالی سے زیادہ نہیں اور وہ اس زعمِ باطل میں مبتلا ہیں کہ مغربی دنیا کے تخیلات اور طریقِ کار کو اختیار کیے بغیر ہمارے احیا کی اور کوئی سبیل نہیں ہو سکتی۔ مسلم اربابِ فکر کی یہ ذہنی کیفیت مجھے نہایت ہی شاق گذرتی ہے، کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات اس کھلی ہوئی حقیقت کا بھی ادراک نہیں کر سکتے کہ دینِ اسلام نے خدائے واحد سبحانہٗ کی عبادت کے ساتھ ہمیں اخلاق و معاشرت کے اصول کا ایک مکمل دستور العمل، ایک کامل نظامِ حیات بھی عطا فرمایا ہے اور یہ دونوں اس درجہ لازم و ملزوم ہیں کہ ہم ایک کو ترک اور دوسرے کو اختیار نہیں کر سکتے۔" (ص ۶۶-۶۷)

پھر فاضل مصنف نے دنیائے اسلام کو تقلیدِ مغرب کے خطرناک نتائج سے بھی اچھی طرح آگاہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

"تفریج یا تقلیدِ مغرب سے کبھی فائدے کی امید رکھنا خطرناک مغالطہ ہے۔ اور محض اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ حامیانِ مغرب کا تخیل ناقص ہے اور وہ ان مسائل سے جو اسلامی دنیا کے واسطے حد درجہ اہم ہیں۔ پوری طرح سے واقف نہیں۔"

نقالی یوں تو فرد کے لیے بھی سخت مہلک ہے مگر اجتماعی زندگی میں اس کی تباہ کاریاں بالکل ناقابلِ بیان ہیں۔ ہر عہد دنیا کی تمام اقوام کے سامنے چند تقاضے پیش کرتا ہے۔ جو قومیں ان کو کامیابی سے

پورا کر دیتی ہیں وہی دنیا میں کامیاب و کامران ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام تقلید سے سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ ان سے وہی قومیں کامیابی سے عہدہ برا ہو سکتی ہیں جو اپنی مخصوص تہذیبی روح سے کام لے کر ان کو پورا کرتی ہیں۔ تقلید سے قوموں کی صلاحیتیں ابھرتی نہیں بلکہ افسردہ ہوتی ہیں۔ وہ ترقی کرنے کی بجائے آغوشِ تنزل میں دم توڑنا شروع کر دیتی ہیں۔

ہمیں فاضل مصنف کے اس نقطۂ نظر سے اختلاف ہے کہ وہ مرض جس میں اسلامی دنیا مبتلا ہے قوانینِ طبیعی سے مسلمانوں کی جہالت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ یہ جہالت انہیں فطرت کی نعمتوں سے محروم اور دنیاوی عسرت و افلاس میں مبتلا رکھتی ہے اور ان کی سیاسی آزادی کی جڑوں کو ہلا دیتی ہے۔ اصل میں اس طرزِ فکر میں ایک بنیادی کمزوری پائی جاتی ہے۔ عرصہ سے مسلمانوں کو یہی سبق دیا جاتا رہا ہے کہ تمہیں اگر دنیا کی خوشحالی مطلوب ہے تو تمہیں یورپ کے علومِ طبیعی کو حاصل کرنا چاہیے۔ یہ بات مختلف طریقوں سے مختلف لوگوں کی زبانی دہرائی گئی مگر آج ہمیں یہ الفاظ اسلام کی تین مقتدر ہستیوں، پرنس حلیم پاشا مرحوم و مغفور، مرحوم پکتھال اور مولانا محمد علی کی زبانی سن کر سخت حیرت ہوئی ہے۔ مسلمانوں کے زوال کو علومِ طبیعی سے غفلت پر محمول کرنا حالات کا نہایت ہی سطحی تجزیہ ہے جو ان حضرات کے شایانِ شان نہیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم ایک مخصوص آئیڈیل اور نصب العین کے پرستار کی حیثیت سے دنیا میں اٹھتی ہے تو پھر اس کے اندر دنیا میں پھیل جانے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ یہ تڑپ اسے جدوجہد پر ابھارتی ہے۔ اور قوم اپنے آپ کو مستحکم کر کے اپنے دائرہ اثر کو وسیع کرتی ہے۔ ظاہر ہے یہ سارے کام صرف مقدس آرزوؤں سے ہی پورے نہیں ہوتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر زندہ اور ترقی کرنے والی قوم کائنات کی چھپی ہوئی قوتوں کا کھوج لگا کر انہیں مسخر کرے اور پھر انہیں کام میں لائے۔ اس طرح طبیعیات کے قوانین از خود اس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ مسلمان جب تک صحیح معنوں میں مسلمان رہے، جب تک اسلام کی محبت ان کے دلوں کو گرماتی رہی، وہ برابر اس کوشش میں رہے کہ اس سے نہ صرف خود فائدہ اٹھائیں بلکہ ساری دنیا کو فیضیاب کریں۔ اسی مقصد کی لگن ان کے اندر سعی و طلب کا

ولولہ پیدا کرتی رہی اور اسی کی بے پناہ قوت سے انہوں نے فطرت کے بڑے راز ہائے سربستہ معلوم کیے اور پھر اُن سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا۔ مگر جب اسلام کی محبت سے اُس کے سینے خالی ہو گئے۔ جب اسلام کا عشق اُن کے دلوں سے مٹ گیا تو نشو و نما رک گئی اور اُن پر انحطاط طاری ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے سوچنا اور غور کرنا چھوڑ دیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علومِ طبیعی کو حاصل کرنے میں بھی اُن کی کوششیں سرد پڑ گئیں۔ آج اگر ہم مفلس اور غریب ہیں، آج اگر ہم ذلیل اور خوار ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم علومِ طبیعی سے ناواقف ہیں بلکہ ان سب کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم اپنے اصل مقصد کو بھول چکے ہیں۔

اس کتاب کے مقدمہ میں مولانا محمد علی صاحب قصوری نے مرحوم مولانا عبیداللہ صاحب سندھی اور سٹالن کی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ہم نے روس میں سٹالن کے سامنے اسلام پیش کیا اور بتلایا کہ اسلام کمیونزم سے دنیا کی معاشی اور سیاسی مشکلات کا بہتر حل پیش کرتا ہے۔ تو اس نے تھوڑے سے سکوت کے بعد کہا کہ مولانا! ممکن ہے کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں صحیح ہو لیکن کیا آپ مجھے فی زمانہ ایک چپہ بھر زمین کا بھی پتہ دے سکتے ہیں جہاں قرآن و سنت کا تجویز کردہ نظام رائج ہو۔ مولانا نے اشکبار آنکھوں سے فرمایا کہ اس کے جواب میں ہمیں خاموش ہونا پڑا۔"

مولانا محمد علی صاحب نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ دوسرے فقرے میں فرما دیا کہ اسٹالن کا اعتراض درحقیقت بالکل بجا ہے۔ اگر یہ اعتراف محض مسلمان کو اُن کی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کے لیے ہے تب تو اس میں کوئی حرج نہیں مگر مولانا سے ہمیں توقع تھی کہ وہ ایسے جذباتی فقروں سے متاثر ہوئے بغیر اس اعتراض کا پوری طرح تجزیہ کر کے بتاتے کہ اس میں کونسی خامی ہے۔ مگر افسوس کہ وہ مولانا عبیداللہ کے ساتھ ہی جذبات کی رَو میں بہہ گئے۔ وہ بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ یہ سچ ہے کہ اس وقت ایک چپہ بھر زمین کا بھی ایسا نہیں ہے جہاں قرآن و سنت کا تجویز کردہ نظام رائج ہو لیکن کیا مارکس کا تجویز کردہ نظام دنیا میں کہیں بھی رائج تھا جب لینن نے روس میں اس کا تجربہ شروع کیا! اس الزامی جواب کے مقابلے میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ تم ایک ایسے نظام کا تجربہ کر رہے ہو جو اس سے

پہلے کہیں بھی رائج نہیں ہوا۔ اور میں نہیں ایک ایسے نظام کی دعوت دیتا ہوں جو عملاً اس دنیا میں قائم ہو چکا ہے اور اس سے بہترین نتائج برآمد ہو چکے ہیں۔ تم ایک ایسے داعی کی دعوت کا تجربہ کر رہے ہو جس کے مفکرے کا بنیادی نظریہ ہی غلط ثابت ہوا ہے ۔۔۔ اس نے کہا تھا کہ اشتراکی انقلاب ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں برپا ہوگا حالانکہ وہ ایک بنجر زرعی ملک میں محض اتفاقاً برپا ہوگیا اور ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں اس کے برپا ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے ۔۔۔ اور میں جس داعی کے نظام حیات کی طرف تمہاری رہنمائی کر رہا ہوں تاریخ شاہد ہے کہ اس کا کوئی مفکورہ اور کوئی تصور غلط ثابت نہیں ہوا بلکہ اس نے تقاولاً بھی جو بات کہی وہ بھی لفظ بلفظ صحیح ثابت ہوئی ۔

ان سب باتوں کے باوجود کتاب میں غور و فکر کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن پر ہمیں نہایت ہی ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے۔ ہمیں جو شکایت ہے وہ صرف یہ کہ اسلام کے ایسے بلند پایہ مفکرین سے ہمیں حالات کے زیادہ گہرے تجزیہ کی توقع تھی ۔

کتابت اور طباعت کا معیار بلند نہیں ۔

نہایت ضروری اعلان بسلسلۂ تفہیم القرآن

گذشتہ شمارۂ ترجمان القرآن میں سنگسازی اور طباعت میں بے احتیاطی کے باعث بہت سے حروف غلط ملط ہو کر رہ گئے جو دراصل یوں ہونے چاہئیں تھے ۔

مقررہ ہدیے :۔ قسم اول ۲۰/۱۲/۰ قسم دوم ۱۸/۴/۰ قسم سوم ۱۱/۰/۰ (قسم اول اور دوم میں گتہ نہ ملنے کی وجہ سے بکس کی قیمت ہم کم کرکے فرمائش کی تعمیل ہوگی۔ بکس تیار ہونے پر حسب سابق بکس کی قیمت وصول کی جائیگی)

قسم اول خصوصی جلد ۲۲/۱۲/۰ ، ۲۴/۱۲/۰ ۔ مطلا سنہری کنارہ ۳۱/۴/۰ ۔ جلد و سنہری کنارہ ۳۳/۰/۰

قسم دوم خصوصی جلد ۱۹/۴/۰ ، ۲۲/۱۲/۰ ۔ مطلا سنہری کنارہ ۲۹/۰/۰ ۔ جلد و سنہری کنارہ ۳۱/۰/۰

قسم سوم خصوصی جلد ۱۱/۸/۰ ، ۱۲/۸/۰ ۔ ۱۳/۴/۰ ۔ علاوہ خرچہ ڈاک وغیرہ ۱/۴/۰

تفہیم القرآن حاصل کرنے کے لیے :۔ ناظم مکتبۂ تعمیر انسانیت۔ گجر گلی موچی دروازہ لاہور کو لکھیے۔

مطبوعات

Islamic Research Circle Bulletin شائع کردہ اسلامک ریسرچ سرکل جماعت اسلامی ہند - رامپور - قیمت آٹھ آنے -

اسلامی فکر و نظر رکھنے والے نوجوانوں کا یہ پرچہ عرصہ سے شائع ہو رہا ہے مگر سائیکلوسٹائل ہونے کی وجہ سے اس کی اشاعت بالکل محدود تھی ضرورت تھی کہ اسے زیورِ طباعت سے آراستہ کرکے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد اس سے استفادہ کر سکیں۔ مقامِ شکر ہے کہ اس ادارہ کے کارپردازوں کو بھی اس کا احساس ہوا۔ چنانچہ نہایت ہی معقول طباعتی معیار کے ساتھ اس پرچے کے نئے دور کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس میں اشارات کے علاوہ دو نہایت ہی معلومات افزا مضامین شامل ہیں۔ زبان اور مضامین کے انتخاب کو اگر ذرا بہتر بنا دیا جائے تو یہ پرچہ نہایت ہی معیاری بن سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ فاضل مدیران پہلوؤں کی طرف خاص توجہ فرمائیں گے۔

Al-Islam شائع کردہ: الاسلام ۲۲/۳ جہانگیر روڈ، کراچی ۵ - فی پرچہ ۸/- سالانہ چندہ پاکستان میں مبلغ ۵ روپے۔ اور بیرون پاکستان ۷ روپے۔

اس عہدِ جدید میں مشرقی ممالک میں جس قدر الحاد اور زندقہ آیا ہے وہ سب مغرب سے یورپی زبانوں کی وساطت سے یہاں پہنچا۔ اس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مغربی زبانوں خصوصاً انگریزی میں اس کی کمزوری کو واضح کرکے اہلِ دنیا کو دینِ حق سے روشناس کرائیں۔ اس سلسلے میں جو کوشش بھی کی جائے وہ مستحسن ہے۔ زیرِ نظر پرچہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس کی اہمیت اور افادیت کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس میں وقت کے تقاضوں کو کافی حد تک نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کا فنونِ لطیفہ میں حصہ اور اس ضمن میں تاج محل کا ذکر نہایت ہی غیر موزوں ہے۔ اسلام نے آخر کہاں اس امر کی اجازت دی ہے کہ ایک بادشاہ سینکڑوں ایکڑ زمین اور کروڑوں روپیہ محض ایک مقبرہ کی تعمیر پر صرف کر دے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ان واقعات کے بیان کرنے سے غیر مسلموں کو اسلام کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمارے انگریزی لکھنے والے طبقے کو مستشرقین کے طرزِ فکر کو چھوڑ کر اسلام کو ایک زندہ وجاوید تحریک کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے۔ اگر ایسا کر دیا جائے تو یہ پرچہ اسلام کی نہایت ہی اچھی خدمت سرانجام دے گا۔

Constitution of Pakistan | از محمد انیس الرحمٰن ایڈوکیٹ، کراچی۔

اس کتابچہ میں مسجد کو ایک اکائی (یونٹ) تصور کرکے پاکستان کے لیے ایک دستوری خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ مسجد کو جو اہمیت اسلام نے دی ہے اُسے پُوری طرح تسلیم کرتے ہوئے بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ فاضل مصنف کہیں کہیں اعتدال سے گزر گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ جو شخص مسجد میں نماز نہیں ادا کرتا اُس کی نمازیں خدا کو سرے سے ہی قبول نہیں، حد سے تجاوز ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کو قانونِ طبیعی کے ہم معنی سمجھنا فاش غلطی ہے۔ اسلام تو دنیا میں آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو سکھائے کہ قوانینِ طبیعی سے کس طرح شرعی اصولوں کے مطابق کام لیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں میں اساسی فرق ہے۔

جن حضرات کو ایسے مسائل سے دلچسپی ہو وہ اِسے براہ راست مصنف سے حاصل کر سکتے ہیں۔

تحفۂ پاکستان | مؤلفہ جناب سلطان محمود صاحب ناظم مدرسہ خادمِ علومِ نبوت کوٹمیالہ شیخاں ضلع گجرات۔ قیمت ایک روپیہ۔ صفحات ۹۴۔ ملنے کا پتہ: مصنف سے براہِ راست حاصل کی جا سکتی ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کے آغاز میں سیاست اور مذہب کے تعلق کو واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اسلام میں یہ دونوں جدا جدا نہیں۔ وہ اسے ایک بہت بڑی انقلابی تحریک سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"اسلام سب سے بڑا انقلابی مذہب ہے اور سراپا سیاست ہے اور جو شخص مذہب اسلام کو سیاست سے بالکل ہی خالی بتائے یا یہ کہے کہ مذہب اسلام کا سیاست

سے بھی کچھ تعلق ہے وہ مذہب اسلام کی حقیقت سے بالکل ہی آشنا نہیں ہے"۔

"مذہب اسلام کے احکام کی ظاہری صورت تو عبادت قرار دی گئی ہے اور مقصد اُن کی سیاست ہے۔ جیسا کہ گرے کی ظاہری صورت تو بان یا سَن کی رسیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور روح اس کی وہ بارُود ہوتا ہے جو ان رسیوں کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے اور اصل رُوح سب کی رضائے مولیٰ ہے"۔

اس کتاب میں جا بجا مسلمانوں کو دعوتِ عمل دی گئی اور بتایا گیا ہے کہ وہ کس طرح خدائی فوج کے صالح سپاہی بن سکتے ہیں۔

کتاب کا انداز بیان البتہ پرانا ہے۔ اہلِ ذوق حضرات اسے مصنف سے قیمتاً حاصل کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کی تباہی کے حقیقی اسباب از مولانا نذیر الحق میرٹھی۔ شائع کردہ مکتبہ تعمیرِ انسانیت گجرگلی اندرون موچی دروازہ۔ لاہور۔ قیمت ۸ر۔ صفحات ۹۶۔

اس کتابچہ میں مسلمانوں کی تباہی کے اسباب پر قرآن اور سنت کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ اور انہیں اُن کا صحیح موقف اور منصب یاد دلایا گیا ہے۔ تحریر کا رنگ سراسر خطیبانہ ہے۔ کتابت اور طباعت بہت حد تک معیاری ہے۔ سرورق رنگین۔ مگر اس سلسلہ میں ناشر سے ہمیں ایک شکایت یہ ہے کہ اگر انہیں سرورق پر نقش و نگار بنانے کا ذوق ہے تو انہیں اس طرح بنائیے کہ وہ کتاب کے نفسِ مضمون کے ترجمان ہوں۔

قصص النبیین (۱) قصص النبیین حصہ اول ضخامت ۶۲ صفحات قیمت دس آنہ (۲) قصص النبیین حصہ دوم۔ ضخامت ۵۹ صفحات قیمت دس آنہ۔ تالیف سید ابو الحسن علی ندوی۔ ملنے کا پتہ ندوۃ العلماء لکھنؤ (بھارت)

پچھلے چند سالوں میں جب سے اسلام کے احیا کی منظم کوششیں کی جانے لگی ہیں، مسلمان قرآن کی زبان سیکھنے کی طرف بھی خاص طور پر متوجہ ہوئے ہیں اور اس کے لیے کئی مفید کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں چھوٹے

بچوں کو کافی حد تک نظر انداز کیا گیا تھا۔ مقام شکر ہے کہ عربی کے فاضل ادیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے اس طرف توجہ فرمائی ہے اور بچوں کی نفسیات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے انہوں نے نہایت ہی کاوش سے یہ دو ریڈریں تیار کی ہیں۔ ان میں بلی، کتے، چوہے کی حرافات نہیں بلکہ خدا کے پاک بندوں یعنی انبیاء کرام کے سچے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ پہلے حصہ میں سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور سیدنا یوسف علیہ السلام کے ایمان افروز واقعات درج ہیں۔ دوسرے حصہ میں حضرت نوح، حضرت ہود، اور حضرت صالح علیہم السلام کے حالات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ ان سے نہ صرف عربی سے مناسبت پیدا ہوتی ہے بلکہ اسلام سے بھی تعلق بڑھتا ہے۔ انداز بیان نہایت دلنشیں اور زبان بہت سلجھی ہوئی ہے۔ اس پر خوبی یہ کہ نہایت ہی مناسب طریق کے ساتھ دین کی لغت سے آشنا کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے جگہ جگہ قرآن پاک کی آیات کو قرینہ سے پلاٹ کے اندر نگینہ کی طرح جڑ دیا گیا ہے۔

یہ دونوں کتابیں مصر میں نہایت ہی اعلیٰ طباعتی معیار پر چھپی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کا پڑھنا بچوں کے لیے انشاءاللہ نہایت ہی فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو اس کار خیر کے لیے اجر عظیم عطا کرے۔ ان میں جو چیز البتہ طبیعت پر گراں گزری ہے وہ سرورق پر اس فقرہ کا وجود ہے:۔

"طبع علیٰ نفقة الخیر الفاضل الشیخ غلام رسول تاجر کالکته"

معلم الانشاء | حصہ اول از: عبدالماجد ندوی ضخامت ۱۰۵ صفحات - دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ)

برصغیر ہند و پاکستان کے عربی مدارس میں عربی پڑھانے کا جو طریقہ برسوں سے رائج ہے وہ ایک فرد کو زندگی کا معتدبہ حصہ اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کو مسلسل صرف کرنے کے بعد بھی اس قابل نہیں بناتا کہ وہ اس زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنا سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے بحیثیت ایک زندہ زبان کے پڑھنے پڑھانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کو بھی ایک نظری علم اور ایک کتابی فن کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کو صرف کتابوں کے سمجھنے تک ہی محدود رکھا جاتا ہے۔ ندوۃ العلماء کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ عربی داں حضرات اس زبان میں تقریر و تحریر کی اہمیت کو بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ زیر نظر کتاب کا مقصد یہی ہے کہ طلباء میں عربی بول چال، عربی ترجمہ و انشاء و عربی ادب سے مناسبت پیدا ہو اور

وہ عربی بولنے جاننے اور سمجھنے پڑھنے میں مہارت پیدا کریں۔ کتاب تعلیم و تدریس کے تازہ ترین اسلوب پر لکھی گئی ہے اور اس میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جملوں اور الفاظ کے انتخاب میں بھی اسلامی ذہنیت نمایاں ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری | مرتب ڈاکٹر وحید قریشی ٹائپ عمدہ صفحات ۴۰۰۔ ناشر مکتبہ جدید، لاہور عام ایڈیشن کی قیمت چھ روپے اور خاص ایڈیشن کی قیمت دس روپے۔ نبیاد کے بیسے غیر مجلد ایڈیشن پانچ روپے میں مل سکتا ہے۔

حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" سے خواہ کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اردو ادب میں "سائنٹفک تنقید" کی نبیاد رکھی۔ اس معاملہ میں اُن کی نگاہ اپنے معصروں سے زیادہ وسیع اور فکر زیادہ گہرا تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شاعری کے مشرقی نظریات کے ساتھ ساتھ مغربی نظریات کو بھی سمیٹنے کی امکانی حد تک کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے کئی جگہ ٹھوکریں بھی کھائی ہیں مگر اس طرف پہلا قدم انہوں نے ہی اُٹھایا۔ یہ قیمتی مقالہ ناشرین کی لاپروائی سے رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مسخ ہوتا جا رہا تھا۔ اردو کے فاضل نقاد ڈاکٹر وحید قریشی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے متن کو ۱۸۹۳ء والے ایڈیشن سے مقابلہ کرکے اسے صحیح صورت میں مرتب کیا ہے۔ اس کے علاوہ شروع میں حالی کے حالاتِ زندگی اور اُن کی تنقیدی حیثیت پر دو قیمتی مضامین لکھے ہیں۔ آخر میں تین ضمیمے ہیں۔ ان میں سے ایک میں تمام وہ مواد جمع کیا گیا ہے جو اب تک مقدمے کے اندراجات کے خلاف یا موافق شائع ہوا۔ اس میں حالی کے مغربی ماخذ بھی ہیں۔ فاضل مصنف نے جس محنت اور عرق ریزی سے حالی کے بارے میں تمام منتشر مواد یکجا کیا ہے وہ اردو ادب پر ایک ایسا احسان ہے جس کا اعتراف نہ کرنا بہت بڑی ناشکری ہے۔

سُود حصّہ دوم مؤلفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی | اپنے معاشی مسائل کے حل کرنے میں اس وقت ہماری اصل الجھن یہ ہے کہ اگر ہم بے قید معیشت کے اصول اختیار کریں تو نظامِ سرمایہ داری اپنی ساری لعنتوں کے ساتھ مسلط ہو جاتا ہے۔ اگر ہم انفرادی ملکیت ختم کرکے تمام ذرائع پیداوار اجتماعی قبضہ تصرف میں دے دیں تو آزادیٔ فکر و گفتار آزادیٔ تحریر

اور آزادی اجتماع کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ایک مرتبہ جو گروہ برسرِ اقتدار آجائے پھر اس کا ہٹانا ناممکن ہو جاتا ہے۔

گویا ایک طرف کو آئی ہے تو دوسری طرف کھائی۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں پوری تفصیل سے اس الجھن کا جائزہ لے کر یہ بتایا ہے کہ اسلام کس طرح انفرادیت و اجتماعیت کے ان دو انتہا پسند نظریات کے بالمقابل ایک متوازن معتدل اور مضبوط نظامِ معیشت پیش کرتا ہے جو نہ تو فرد کی آزادی کو بالکل ہی سلب کرتا ہے اور نہ اسے شترِ بے مہار کی طرح بالکل بے قید ہی چھوڑ دیتا ہے اس متوازن نظامِ معیشت کے بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن سُود کی حرمت ہے۔ فاضل مصنف نے سود کی عقلی توجیہات اس کے معاشی "فوائد" و ضرورت کا جائزہ لینے کے بعد پوری تفصیل کے ساتھ اس کے اخلاقی، روحانی، تمدنی، اجتماعی اور معاشی نقصانات گنائے ہیں اور اس کی اصلاح

(بقیہ صفحہ 133)

---

1 سود حصۂ سوم مولفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

2 Hartley withers : Case for capitalism.

3 G. D. H Cole . S mple case for socialism.

4 G. D. H. Cole : Out of work.

5 Joseph Leighton : Social philosophies in conflict.

6 Fritz Sternberg : Capitalism & socialism on Trial.

7 Bertrand Russel : Roads to freedom.

8 Eric Gill : Money & Morals.

9 R. H. Tawney : Religion & Rise of capitalism.

10 Lord Keynes : The General Theory of Employment, Interest & Money.

11 Kenneth K. Kuri hara : Monetary Theory and Public Policy.

12 Thomas Wilson : Modern Capitalism & Economic progress.

13 Pigoma Socialism versus Capitalism.

14 J. Taylor Peddie : Capitalism is Socialism with Economic adjustments.

15 Henrisee : Modern Capitalism.

16 Maurice Dobb : Capitalist Enterprise and social progre s.

17 Maurice Dobb Studies in the Development of Capitalism.

سرورق دین پریس، لاہور میں چھپا